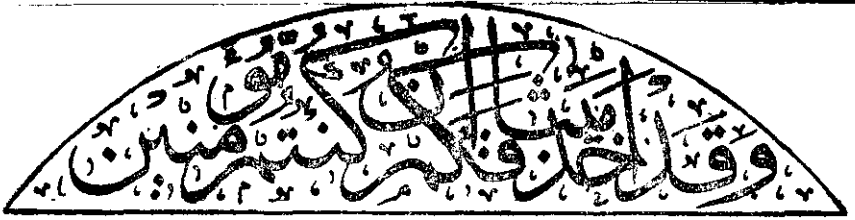

ماہنامہ

میثاق

لاہور

اگست ۱۹۸۰ء

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن - لاہور

(فون : 852683 - 852611)

چندہ سالانہ -/۲۰ ——— قیمت فی شمارہ -/۲

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۲۹ | جولائی ۔ اگست ۱۹۸۰ء | عدد ۷ ، ۸

مشمولات

عرض احوال	ڈاکٹر اسرار احمد	۱
"گاہے گاہے باز خواں....."	" " "	۱۱
"ہائے اس زود پشیماں....."	ادارہ	۱۵
امریکہ (شکاگو) سے ایک خط	ڈاکٹر خورشید ملک	۲۲
لذت ایمان (درس حدیث)	مولانا محمد حسین میر	۲۵
کشتی نوح	جناب شاهد مظفر	۲۹
فتاوی عالمگیری	حافظ منظور احمد	۳۲
تبصرہ بر "سہر منیر"	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۳۷
قرآن اور آثار کائنات	محمد یونس ایم ۔ اے	۴۱
نظام مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم: کیا؟ کیوں؟ کیسے؟	فرید احمد محبوب ترمذی	۶۵
"میں بھی حاضر تھا وہاں"	"الدعوۃ" قاہرہ	۸۹
دارالعلوم دیوبند کا موجودہ خلفشار ...	"الفرقان" لکھنؤ	۹۳

ضروری اعلان

(۱) ماہنامہ "**میثاق**" کے ہندوستانی خریداروں سے گذارش ہے کہ وہ سالانہ زر تعاون مبلغ بتیس روپے حسب ذیل پتہ پر ارسال کر کے منی آرڈر کی رسید ہمیں پاکستان بھیج دیں ۔ پرچہ جاری کر دیا جائے گا ۔
ماہنامہ "**الرسالہ**" جمعیت بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ۔ دہلی

(۲) مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مطبوعات کے لئے بھی رقم مندرجہ بالا پتہ پر ارسال کرکے منی آرڈر کی رسید ہمیں بھیجی جا سکتی ہے ۔

(۳) مولانا وحید الدین خان صاحب کا ماہنامہ "**الرسالہ**" دہلی اور ان کی مطبوعات کے پاکستانی خریدار ہم سے رابطہ قائم فرمائیں ۔

مینجر ماہنامہ "**میثاق**"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسرار احمد

عرضِ احوال

'میثاق' کا پیشِ نظر شمارہ ـــــ نہ صرف یہ کہ دو ماہ کی مشترک اشاعت ہے بلکہ دو اشاعتیں اکٹھی کرنے کے باوجود بھی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے، اس کا سبب راقم الحروف کی مسلسل علالت ہے جس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس لئے کیا جا رہا ہے کہ قارئین 'میثاق' بھی اللہ سے دُعا کریں کہ وہ راقم کو شفا عطا فرمائے تاکہ کتابِ مبین اور دینِ متین کی جس حقیر سی خدمت کے لئے اس نے اپنے آپ کو وقف کیا ہوا ہے اس کا سلسلہ سابق تندہی اور جوش و خروش کے ساتھ جاری رہ سکے۔ وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰہِ بِعَزِیز۔

دروسِ قرآن، تقاریر اور خطابات عام کی کثرت کے باعث راقم کے گلے میں خراش اور سوزش کی شکایت تو گذشتہ دس بارہ سال سے مسلسل چلی آرہی ہے ـــــ جس کے لئے وقتاً فوقتاً مخالف جراثیم ادویات (ANTI BIOTICS) کا استعمال معمول سا بنا رہا ہے جسے خالص طبّی اصولوں کے مطابق تو 'MISUSE' قرار دینا غلط نہ ہوگا ـــــ تاہم اس طرح وہ فوری اِفاقہ ہو جاتا تھا جس سے کام جاری رکھا جا سکے۔

گذشتہ سالانہ قرآن کانفرنس (منعقدہ اپریل ۸۰) کے دوران اور اس کے بعد محسوس ہوا کہ تکلیف بڑھ رہی ہے اور معمولی ادویات سے اِفاقہ نہیں ہو رہا۔ تو مجبوراً اوائل ماہ جون میں گلے کے امراض کے ماہر معالجین سے رجوع کرنا پڑا۔ لاہور کے دو چوٹی کے ماہرین نے بالاتفاق FUNGUS INFECTION تشخیص کی، اور کسی قدر تشویش کا بھی اظہار کیا، اور آرام کا مشورہ بھی دیا اور نئی ادویات بھی تجویز کیں۔ اب یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ یہ ان ادویات کے منفی اثرات کے تحت ہوا یا

ویسے ہی قضائے الٰہی سے، بہرحال سوزشِ امعاء اور اس کے نتیجے میں بخار کے ساتھ اسہال اور پیچش کا حملہ ہو گیا - جس کی شدّت اتنی ہوئی کہ کراچی کے دورے کا پروگرام جس کے لئے وہاں کافی اہتمام بھی ہوا تھا - اور اعلانِ عام بھی کیا گیا تھا عین وقت پر منسوخ کرنا پڑا - یہ حادثہ راقم کی گذشتہ پندرہ سالہ مساعی کے دوران پہلی مرتبہ پیش آیا تھا لہذا طبیعت نے اس کا اثر بھی قدرے زیادہ ہی لیا - اور شاید یہ اسی کا نتیجہ ہو کہ ایک روز اچانک بخار بھی بہت تیز ہو گیا اور ساتھ ہی سینے میں بائیں جانب شدید درد بھی ہوا — جس کے بارے میں فوری طور پر راقم کے لئے یہ فیصلہ آسان نہ تھا کہ یہ دل سے متعلق ہے یا پھیپھڑے یا پٹھوں سے، — اتفاق سے اس وقت گھر پر نہ بڑے بچے موجود تھے نہ ان کی والدہ صرف بچیاں تھیں، ادھر درد اتنا شدید تھا کہ نہ ہلنے جُلنے دیتا تھا نہ معمول کے مطابق سانس لینے دیتا تھا، صرف اوپر اوپر کا سطحی سا سانس لینا ممکن تھا ایک مرحلہ پر تو صورتِ حال ایسی ہو گئی کہ بچیوں نے رونا شروع کر دیا — بعد میں تفتیش پر معلوم ہوا کہ یہ UIRUS INFECTION، جو جتنی تیزی سے آئی تھی اتنی ہی سرعت سے ختم بھی ہو گئی البتہ ماہرین کے مابین یہ اختلافِ رائے تاحال قائم ہے کہ متاثر عضو بائیں پھیپھڑے کا نچلا حصہ تھا، یا سینے کے عضلات، خدا کا شکر ہے کہ اس امر پر اتفاق ہے کہ اس کا کوئی تعلق قلب سے نہ تھا! بہرحال چند دن کے اندر اندر INFECTION کے 'سلوک' کے تمام مراحل بھی طے ہو گئے اور جملہ مقامات کی سیر بھی ہو گئی !![1]

اس کے بعد سے مسلسل ہلکی حرارت چل رہی ہے - جو ذرا سی محنت، خصوصاً درس یا خطاب عام سے بڑھ جاتی ہے، — قوتِ کار بہت کم ہو گئی ہے، توانائی گویا اندر ہی اندر ختم ہو رہی ہے، ۱۱ر جولائی والے جمعے کو یہ حادثہ بھی پیش آیا کہ خطبے کے دوران اچانک اتنی نقاہت محسوس ہوئی کہ شدید اندیشہ ہوا کہ اگر خطبہ جاری رکھا تو ہو سکتا ہے کہ گر جاؤں لہذا مضمون کو درمیان میں چھوڑ کر خطبہ فوری طور پر ختم کرنا پڑا — درس قرآن کے باقی تمام پروگرام تو پہلے ہی منسوخ ہو چکے تھے، اس روز مجبوراً یہ اعلان بھی کرنا پڑا کہ تا اطلاعِ ثانی مسجد شہداء کا

[1] یعنی BACTERIAL، FUNGAL اور UIRAL ہمہ اقسام کی INFECTIONS

درس بھی میں نہ دے سکوں گا — (میری جگہ یہ ذمہ داری اب میرے ایک نوجوان رفیق کار ڈاکٹر عبدالسمیع سرانجام دے رہے ہیں!)

بہرحال یہ ہے وہ سبب جس کے باعث 'میثاق' کی اشاعت میں اتنی تاخیر تعویق ہوئی، جس کے لئے میں قارئین سے معذرت خواہ بھی ہوں اور دعا کا خواستگار بھی۔ — بلکہ جب اتنی تفصیل بیان ہوگئی تو ساتھ ہی ساتھ یہ معذرت ان بزرگوں، دوستوں، عزیزوں اور کرم فرماؤں کی خدمت میں بھی پیش ہے جن کے خطوط کا انبار لگا ہوا ہے — اور کسی کو جواب نہیں دیا جا سکا — اُمید ہے کہ یہ سب حضرات میری اس معذرت کو قبول فرمالیں گے!

راقم کی صحت کی کچھ ایسی ہی کیفیت آج سے ٹھیک دس سال قبل ۶۸ء میں بھی ہوگئی تھی۔ یعنی یہ کہ مسلسل حرارت رہتی تھی۔ جس کے ضمن میں ایک بار تو تپ دق تک کی تشخیص ہوگئی تھی جو بعد میں غلط ثابت ہوئی، اصل سبب کام کا دباؤ اور متضاد قسم کی مصروفیات کی رسہ کشی تھی جس نے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ ایک جانب مطب اور اس کی ذمہ داریاں تھیں، دوسری جانب حلقہ ہائے درس قرآن تھے، تیسری جانب "دارالاشاعت الاسلامیہ" اور سب سے بڑھ کر 'میثاق' تھا جس کے بارے میں اب غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ۶۹ء کے دوران پوری باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ پورے اسّی صفحات پر مشتمل شائع ہوتا رہا — اس چومکھی جنگ کے باوجود صحت جواب نہ دیتی تو یہ امر باعث تعجب ہوتا۔ بہرحال چار ساڑھے چار سال کی محنت شاقہ کے نتیجے میں اوائل ۷۰ء میں صحت نے جواب دے دیا۔ اور وہ بحال ہوئی تو صرف اس طرح کہ اولاً چار ماہ ملک سے باہر رہا۔ اور اس عرصے کے دوران رمضان مبارک (اکتوبر، نومبر ۷۰ء) مدینہ منورہ میں بسر کیا۔ پھر ایک ماہ (دسمبر، جنوری) برادر عزیز ڈاکٹر ابصار احمد سلمہ کی دعوت پر انگلینڈ کی سیر کی، بعدازاں ایک ماہ پھر ارض مقدس میں بسر کیا اور حج کی سعادت حاصل کی — اور ثانیاً اس پورے عرصے کے دوران غور و فکر کے نتیجے میں بالآخر حج ہی کے موقع پر یہ حتمی فیصلہ کر لیا کہ آئندہ مطب بند، ڈاکٹری کے پیشے کو الوداع، اور کُل کی کُل قوت و استعداد اور تمام کے تمام اوقات کامل یکسوئی

کے ساتھ وقف برائے خدمتِ قرآن حکیم و احیا و اقامتِ دینِ متین ——— اس طرح راقم کی زندگی کا یہ 'قبض'، ایک نئے 'بسط'، کا پیش خیمہ بن گیا ——— اور

ع "رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور!" کے مصداق مارچ ۱۹۷۱ء سے راقم کی مصروفیات کا وہ طوفانی دَور شروع ہوا جس کے ابتدائی چار سال کی مساعی کے نتیجے میں اوّلاً ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس عمل میں آئی اور پھر ۱۹۷۵ء میں 'تنظیمِ اسلامی'، قائم ہوئی۔

راقم کی حالیہ علالت کے ساتھ بھی ایک شدید قسم کی باطنی 'قبض' کی کیفیت شامل ہے۔ جس میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" یا بالفاظِ دیگر قنوطیت کا عنصر غالب ہے۔ چونکہ انسان کی جسمانی صحت اور نفسیاتی و رُوحانی کیفیات ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتی ہیں لہٰذا جہاں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ باطنی 'قبض' علالت کا نتیجہ ہو وہاں یہ بھی عین ممکن ہے کہ اصل علّت باطنی کیفیت ہو اور علالتِ جسمانی کی حیثیت معلول کی ہو۔ واللہ اعلم!

"اندیشہ ہائے دور و دراز" کے ضمن میں اوّلین معاملہ تو خود پاکستان اور اس کے مستقبل کا ہے، جس کے ضمن میں اندرونی و بیرونی دونوں اعتبارات سے معاملہ مخدوش سے مخدوش تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ ایک طرف حال یہ ہے کہ ایک ملک اور قوم کی عمرِ عزیز کے تینتیس سال گذرنے کے باوجود ابھی یہ معاملہ تصفیہ طلب ہی ہے کہ یہاں نظامِ حکومت کیا ہو؟ - گویا اس کے اعتبار سے تا حال ہم بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچے بلکہ ابھی عہدِ طفلی ہی میں ہیں - ہماری اس حالت کے کسقدر مناسب ہے یہ شعر کہ ؎

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت   مزاجِ تو از حالِ طفلی نگشت!

آج سے ۲۸ سال قبل جب راقم میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھا اور اسلامی جمعیت طلبہ کے آرگن ہفتہ وار 'عزم'، کو ایڈٹ کرتا تھا تو ان دنوں بھی پاکستان کے 'دستور'، کا مسئلہ مختلف فیہ تھا چنانچہ جس طرح آج کل بعض اخبارات اس مسئلے پر خطوط و آراء شائع کر رہے ہیں بالکل اسی طرح راقم نے بھی 'عزم'، میں اس شعر کو عنوان بنا کر اس کے ذیل میں مضامین اور خطوط کی اشاعت کا سلسلہ

شروع کر رکھا تھا کہ ؎

اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں اس فکر میں غنچے سوکھ گئے
آئین گلستان کیا ہوگا دستورِ بہاراں کیا ہوگا !!

کس قدر قابل رحم ہے یہ صورتِ حال کہ ربع صدی سے زیادہ عرصہ بیت جانے کے بعد بھی اس مسئلے میں "ہنوز روز اوّل" والا معاملہ ہے۔ اور یہ بے یقینی اور گومگو کی کیفیت کس قدر خوفناک نتائج پیدا کر سکتی ہے اس کا اندازہ ہر صاحب شعور انسان بخوبی کر سکتا ہے۔

دوسری طرف کم از کم راقم کا مشاہدہ یہ ہے کہ ہماری بعض اجتماعی غلطیوں کے باعث جن کی تفصیل میں جانا اس وقت نہ ممکن ہے نہ مناسب، پاکستان کے عوام کے ایک خاصے بڑے اور موثر طبقے میں دین سے فرار اور بے زاری کی کیفیت تیزی سے بڑھ رہی ہے — اس سلسلے میں راقم نے جو تجزیہ اکتوبر ۱۹۷۳ء کے میثاق، میں شائع کیا تھا وہ اس شمارے میں پھر شائع کیا جا رہا ہے اس سے راقم کے احساسات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے — اس لئے کہ اس وقت کے مقابلے میں صورت حال کہیں سے سنگین تر ہی ہوئی ہے، بہتری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

بیرونی خطرات کا معاملہ اندرونی خدشات سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ چنانچہ ایک طرف روسی جارحیت کا سیلاب ہمارے دروازوں تک پہنچ گیا ہے اور ہماری پوری شمال مغربی سرحد اس کی براہ راست زد میں ہے دوسری طرف جنوب مشرق میں اندرا گاندھی اور اس کی حکومت کے تیور بدلتے نظر آ رہے ہیں یا یوں کہہ لیں کہ ان کا اصل روپ دوبارہ نکھر کر سامنے آ رہا ہے، ہر قسم کی اسلحہ سازی میں پوری طرح خود کفیل ہونے کے باوجود اربوں روپے کا اسلحہ اپنے روایتی دوست روس سے خریدا جا رہا ہے۔ اور کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پردے میں کچھ عجب نہیں کہ پھر گنگا کیس کی طرح کا کوئی ڈرامہ کھیلنا مقصود ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بظاہر پاکستان کی آزادی اور خود اختیاری کی ضمانت دینے والا امریکہ۔ پاکستان کو بھارت کے ایک طفیلی ملک کا

درجہ دے کر کم ازکم اپنی حد تک تو اسے بھارت کے چرنوں میں پیش کر ہی چکا ہے - حال ہی میں بھارت میں امریکی سفیر مسٹر گوئن نے جو برسرِعام اور برملا گل افشانی کی ہے اس امر کے بعد بھی اگر کوئی اس معاملے میں شک کرتا ہے تو اس کی سادہ لوحی یقیناً قابلِ داد ہے - الغرض بیرونی صورت حال اس شعر کی کامل مصداق ہے کہ ؎

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

پاکستان سے آگے عالمِ اسلام پر نگاہ ڈالیے تو وہاں بھی اکثر و بیشتر معاملہ دگرگوں ہی نظر آتا ہے - افغانستان ع "ہوگیا ماند آب ارزانِ مسلماں کا لہو!" کی تصویر بنا ہوا ہے - نہتے شہری اور مجاہدین حریت مرتے ہیں تو وہ بھی مسلمان ہیں اور ادھر سرکاری افغان فوج کے لوگ مارے جاتے ہیں تو وہ بھی کلمہ گو ہیں اور انہوں نے بھی مسلمان ماؤں کا دودھ پیا ہے — لاکھوں کی تعداد میں قتل اور بے خانماں تو مسلمان ہی ہوئے ہیں، روسیوں کا نقصان تو سینکڑوں میں نہیں تو زیادہ سے زیادہ ہزاروں میں ہوا ہو گا — ایران میں پورا معاملہ MELTING POT میں نظر آتا ہے - پہلے سابق واَنجہانی شاہ نے خون کی ہولی کھیلی تھی تو اب "انقلاب" اپنا بدلہ چکاتا نظر آ رہا ہے - اور سب سے بڑھ کر یہ شدید اندیشہ ہے کہ کہیں راسخ العقیدہ علماء اور لبرل مسلمانوں کے مابین کشمکش مسلح تصادم کی صورت اختیار نہ کر لے — اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو سارا فائدہ کمیونسٹوں کو پہنچے گا اور ع ؎ "خود بخود تیار ہے پکتے ہوئے پھل کی طرح - دیکھیے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ!" کے مصداق ایران ازخود روس کے ہتھے چڑھ جائے گا! — عرب ممالک میں تو ان کے اختلافات جوں کے توں ہیں، بعض کا رخ امریکہ کی جانب ہے تو بعض کا روس کی جانب — حد ہے کہ افغانستان میں روس کی موجودہ ننگی جارحیت کے باوجود بھی بعض مسلمان ممالک کے کھلاڑیوں نے ماسکو اولمپکس میں حصہ لیا ع "خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے!"

ان سب پر مستزاد اور ان سب سے بڑھ کر قابل حذر اندیشہ یہ ہے کہ بعض مسلمان ممالک میں اسلام کے احیا و نفاذ کے ضمن میں زبان کا پھاگ جس قدر زور شور اور شد و مد سے کھیلا گیا ہے بغیر اس کے کہ اس کے اصل اور ناگزیر ابتدائی لوازم (PRE - REQUISITES) کا مناسب حد تک اہتمام کیا گیا ہو اس کے نتیجے میں خدانخواستہ ایک شدید ردِ عمل نہ پیدا ہو جائے۔ اور مایوسی اور بددلی (FRUSTRATION) کی لہر عالم اسلام کی نوجوان نسل کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے — اور وہ دین کی جانب سے بالکل دل برداشتہ (DISILLUSION) ہو کر نہ رہ جائے —

الغرض یہ — اور اسی قبیل کے بہت سے دوسرے خدشات، جن کا ذکر بھی فی الوقت مناسب نہیں ہے، دل و دماغ پر قابض ہیں اور ان کا ایک شدید دباؤ راقم کے اعصاب پر ہے، جس کے نتیجے میں 'قبض' کی کیفیت طول کھینچتی چلی جا رہی ہے۔

ان حالات میں جب گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی کینیڈا اور امریکہ سے دعوت موصول ہوئی تو راقم نے خیال کیا کہ شاید 'شفٹ' کے مانند اب بھی دو تین ماہ کے لئے ملک سے باہر چلے جانا جسمانی صحت کی بحالی اور باطنی 'قبض' کے ازالے کے ضمن میں مفید ثابت ہو۔ لہٰذا اس کے باوجود کہ اس وقت اندرون ملک راقم کی سرگرمیاں بہت حد تک منجمد ہیں راقم نے 'باہر' کی یہ دعوت قبول کر لی۔

گذشتہ سال کے دورۂ امریکہ، کینیڈا اور مصر کی روداد کی پہلی قسط اس سال جنوری اور فروری کی مشترک اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ خواہش تو شدید تھی کہ اس سال کے سفر سے قبل اس کا بقیہ حصہ بھی حیطۂ تحریر میں آ جاتا اور 'میثاق' میں شائع ہو جاتا۔ لیکن "ما شاء اللہ کان و ما لم یشأ لم یکن" کے مطابق یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

گذشتہ سال یوں تو امریکہ اور کینیڈا کے بہت سے شہروں میں جانا ہوا تھا لیکن جم کر کام صرف ایک ہی مقام یعنی ٹورنٹو میں ہوا تھا۔ جہاں مسلسل دو ہفتے

تک روزانہ درس کا سلسلہ بلاناغہ جاری رہا تھا اور سامعین کی تعداد بھی وہاں کے حالات کے اعتبار سے ناقابل اعتبار حد تک کثیر تھی اور ان کی عظیم اکثریت کی شرکت مسلسل بھی تھی اور باقاعدہ بھی - اس کے علاوہ کینیڈا میں مانٹریال، اور اٹاوہ ایسے بڑے اور اہم شہروں کے ساتھ ساتھ نیاگرا، کچر اوشوا، وغیرہ ایسے 'قصبات' میں بھی جانا ہوا اور وہاں بھی ایک ایک دو دو نشستیں درس قرآن کی ہوئیں — ریاستہائے متحدہ امریکہ کے شہروں سے بالٹی مور، واشنگٹن اور ڈلاس کا ذکر تو مطبوعہ روداد میں ہو چکا ہے، ان کے علاوہ دو تین دن شکاگو میں بھی بسر ہوئے تھے - جہاں درس قرآن کی ایک نشست ڈاؤنرز گرو میں ڈاکٹر خورشید ملک صاحبؒ کے مکان پر ہوئی تھی - اور ایک تقریر مسلم کمیونٹی سنٹر میں اور ایک خطاب 'اسلامک فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام ہوا تھا — اس کے علاوہ وہاں بہت سے حضرات سے مفصل ملاقاتیں ہوئی تھیں جن کی خوشگوار یاد بھی ابھی تک حافظے میں موجود ہے، اور ع "خدایا آں کرم بارے دگر کن!" کے مصداق ان کی تجدید کی خواہش بھی شدید ہے — ان میں سے نمایاں نام ڈاکٹر وصی اللہ خاں صاحب، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر سید اسد حسین صاحب اور برادرم عرفان احمد خاں صاحب کے ہیں -

واقعہ یہ ہے کہ شکاگو ایک شہر نہیں پورا ملک ہے - اس کے لئے گزشتہ سال میں صرف تین دن نکال سکا تھا اور ان میں سے بھی ایک دن بفلو کے سفر میں گذر گیا - اس لئے کہ ۲۲ ستمبر کو وہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کے انتقال کی اطلاع ملی تھی اور وہیں سے میں برادرم ڈاکٹر ظفر الحق انصاری اور چار پانچ دیگر حضرات کی معیت میں بفلو جاکر مولانا کی نماز جنازہ میں شریک ہوا تھا - بنابریں شکاگو میں کام بہت کم ہو سکا تھا - اب اس سال شکاگو میں بھی بالکل ٹورنٹو ہی کی طرح مسلسل دو ہفتے کے قیام اور درس قرآن کا پروگرام ہے - اُمید واثق ہے کہ وہاں بھی ٹورنٹو ہی کی سی کیفیت رہے گی - واللہ اعلم! (شکاگو میں درس اس سال ۱۲ سے ۲۶ تک رہے گا، ان شاء اللہ!)

لہ ڈاکٹر صاحب کا ایک خط بھی شامل اشاعت ہے -

شکاگو سے دیسے تو راقم کو واپسی کے سفر کے لئے سیدھے نیویارک آجانا چاہیئے تھا لیکن چونکہ ٹورنٹو میں جماعت اسلامی کے حلقہ احباب سے معلوم ہوا تھا کہ مولانا مودودی صاحب کی صحت اب روبہ اصلاح ہے اور امید ہے کہ چند روز اور ان سے ملاقات ہوسکے گی لہذا میں نے ٹورنٹو سے شکاگو جاتے ہوئے واپس ٹورنٹو ہی آنے کا پروگرام بنالیا تھا تاکہ وہاں سے احباب کے ہمراہ بفلو جاکر مولانا سے ملاقات کی جاسکے (واضح رہے کہ بفلو نیاگرا سے بہت قریب ہے اور نیاگرا ٹورنٹو سے کل اسّی میل کی مسافت پر ہے!) — لیکن قضائے الٰہی سے مولانا سے زندگی میں ملاقات کی حسرت تو دل ہی میں رہ گئی اور شکاگو سے بفلو جاکر صرف ان کی صورت دیکھنے اور نماز جنازہ ادا کرنے کا موقع مل سکا۔ بہرحال میں پروگرام کے مطابق شکاگو سے واپس ٹورنٹو آیا — اور پھر وہاں سے دو دن بعد نیویارک گیا — جہاں خیال تو صرف یہ تھا کہ کچھ سیر ہوجائے گی اس لئے کہ وہاں پہلے سے رابطہ کسی سے بھی نہ تھا۔ لیکن وہاں کے پانچ دن حد درجہ مصروف گذرے — درس قرآن کی بھی کئی نشستیں ہوئیں اور بعض ملاقاتیں بھی بالکل اسی نوعیت کی ہوئیں جیسی شکاگو میں ہوئی تھیں، مولانا یوسف اصلاحی (جماعت اسلامی ہند) اور ان کے برادران نسبتی، مزمّل اور مدثّر صاحبان کی ملاقات سے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ مولانا ناظم ندوی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، (مدثّر صاحب ان کے داماد ہیں!) مزمّل صدّیقی صاحب رابطہ عالم اسلامی کے نیویارک کے دفتر میں اہم منصب پر فائز ہیں ان سے ملاقات کے ضمن میں اس دفتر کی سیر بھی ہوگئی۔ جمعیت طلبہ کے زمانے کے ایک ساتھی عارف حسین عارف صاحب سے بھی ایک طویل عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔ اور سٹیٹن آئی لینڈ میں واقع ان کے مکان پر بھی جانا ہوا اور وہیں ڈاکٹر قیصر صاحب کے مکان پر درس قرآن کی ایک نشست بھی ہوئی — اور سب سے بڑھکر یہ کہ مسلم سنٹر آف نیویارک میں درس قرآن کی دو نشستیں ہوئیں جن میں بعض نہایت ذہین اور فعال نوجوانوں سے تعارف حاصل ہوا۔ جن میں انور حسین صاحب، ذکاء اللہ صاحب، شمشیر علی بیگ صاحب، ظہیر صاحب، حیدر امام صاحب اور محمد رفیع صاحب قابل ذکر ہیں۔ افسوس کہ راقم وہاں سے آنے کے بعد ان حضرات سے رابطہ نہ رکھ سکا۔

بہرحال اُمید ہے کہ اب پھر ان حضرات سے ملاقات ہو گی اور کیا عجب کہ آئندہ کے لئے مستقل رابطے کی صورت پیدا ہو جائے۔

نیویارک کے ذکر میں بڑی کمی رہ جائے گی اگر دو حضرات کا تذکرہ نہ ہو، ایک استاذ مکرم ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ صاحب مرحوم و مغفور کے صاحبزادے ڈاکٹر نعیم اللہ صاحب جو عربی کہاوت "الولد سرٌ لابیہ" کا منہ بولتا ثبوت ہیں، وہی شکل و صورت، وہی ڈیل ڈول، اسی طرز کی داڑھی اور مزاج میں وہی تواضع اور ملنساری ــــ ان سے راقم کی یہ پہلی ملاقات تھی لیکن انہوں نے شرمندہ کر دینے کی حد تک تواضع کی۔ اور دوسرے راقم کے رفیق و معاون اور یکے از مؤسسین مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور میاں محمد رشید صاحب کے صاحبزادے طارق رشید جن کا اپنا عملی رجحان تو تاحال دین یا دینی سرگرمیوں کی جانب زیادہ نہیں ہے تاہم انہوں نے نہایت محبت اور احترام کے ساتھ راقم کی مہمان نوازی کی اور حد درجہ اصرار کے ساتھ قیام اپنے ہی پاس رکھا۔

گذشتہ سال راقم نے شمالی امریکہ میں کُل ۲۴ دن صرف کئے تھے، یعنی از ۱۲ر اگست تا ۲ر اکتوبر، اس سال پھر ان شاء اللہ ۲۳ر اگست کو کراچی سے براستہ نیویارک سیدھے ٹورنٹو جانا ہوگا۔ ستمبر کے اواخر تک کا پروگرام تو ٹورنٹو اور شکاگو کا ہی ہے ــــ اس کے بعد نیویارک وغیرہ میں کتنے دن لگیں یہ اللہ ہی کو معلوم ہے، ــــ بعد ازاں لندن جانے کا پروگرام ہے ــــ اور خیال یہ ہے پاکستان سے کل غیر حاضری ڈھائی ماہ سے زیادہ نہ ہو۔ تاہم چونکہ یہ پورا عرصہ تو اللہ نے چاہا تو "بامشقت" ہوگا۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اگر اس 'تبدیلی' سے صحت بحال نہ ہوئی تو راقم واپسی پر پھر 'ارضِ مقدس' کا رخ اختیار کرے اور وہاں کی روحانی برکات کے ذریعے اپنے 'قبض' کے ازالے کی کوشش کے مقصد زندگی اور نصب العین کی جانب پیشقدمی کے ضمن میں از سر نو STOCK-TAKING کے بعد آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں کچھ منصوبہ بندی کر کے آئے، اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الحق حَقًّا وارزقنا اتباعہٗ وارنا الباطلَ باطلًا وارزقنا اجتنابہٗ واھدنا یاربنا برحمتك سُبُلَ السّلامِ واجعلنا بفضلك من الرّاشدین آمین یارَبَّ العٰلمین ــــ!!

گاہے گاہے باز خواں ... ماخوذ از ... میثاق اکتوبر ۷۷ء

تذکرہ وتبصرہ

انتخابات غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی ہوگئے اور نہ صرف انتخابی بلکہ ہر قسم کی سیاسی سرگرمی پر پابندی لگ گئی۔ اور اس طرح پاکستان کی تیس سالہ تاریخ کے تیسرے مارشل لاء کا دَورِ اوّل ختم ہوگیا اور دَورِ ثانی شروع ہوگیا۔

موجودہ مارشل لاء کا نفاذ ابتداءً محدود (تقاسما ہ) متعین مدت کے لیے ہوا تھا۔ اور اس کی نوعیت ملک کے سیاسی وجمہوری عمل میں ایک وقتی رکاوٹ (IMPASSE) کو دُور کرنے والی فوری و عارضی اصلاحی تدبیر۔ (TEMPORARY CORRECTIVE-MEASURE) کی تھی۔ چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے 'OPERATION FAIR-PLAY' کے تحت اقتدار سنبھالتے ہی انتخابات کے لیے نوّے دنوں کی مدت بھی معیّن کردی تھی۔ اور اس عزم کا اظہار بھی کردیا تھا کہ وہ سیاسی عمل کے اہم اور نازک مرحلے یعنی عام انتخابات میں صرف ریفری کا کردار سرانجام دیں گے اور اپنی جملہ مساعی کو صرف آزاد اور غیر جانبدار انتخاب منعقد کرانے پر مرتکز رکھیں گے۔

لیکن جلد ہی صورتِ حال تبدیل ہوگئی، اور بقول خود اُن کے جو حقائق وواقعات ان کے سامنے آئے انہوں نے انہیں ہلا کر رکھ دیا اور وہ 'احتساب' کا عمل شروع کرنے پر مجبور ہوگئے اور اور یہی 'احتساب' کا عمل بالآخر اس پر منتج ہوا کہ انتخابات غیر معیّنہ عرصے کے لیے ملتوی اور 'احتساب' کے ساتھ ساتھ 'اصلاحِ حال' اور 'تعمیرِ نو' کی جدوجہد شروع! اس طرح اب مارشل لاء کے جس دَور کا آغاز ہوا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت مشابہ ہے اس پہلے مارشل لاء سے جو ۵۸ء میں سابق صدر ایوب نے نافذ کیا تھا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی مدت کتنی طویل ہوگی!

ان حالات میں دو سوالات تو وہ ہیں جو ہر محفل میں گفتگو کا موضوع بنے ہوئے ہیں یعنی ایک یہ کہ اب کیا ہوگا؟ کیا حالات واقعۃً درست ہوجائیں گے؟ یا یہ بھی ایک عارضی وقفہ ہی ثابت ہوگا اور ملک پھر دو متحارب قوتوں کے تصادم کی جولان گاہ بن جائے گا؟ اور آیا یہ ملک

قائم بھی رہے گا یا نہیں ؟ وقس علیٰ ھٰذا ـــــ اور دوسرے یہ کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے؟ ہماری قومی و ملّی زندگی کو استحکام کیوں نصیب نہیں ہو رہا ؟ ہماری ملکی سیاست کی گاڑی کا انجن بار بار بند کیوں ہو جاتا ہے ؟ اور ہم ایک دائرے ہی میں کیوں حرکت کئے چلے جا رہے ہیں ؟ ـــــ اور ایک سوال وہ ہے جس پر ہر ذی شعور پاکستانی مسلمان کو اپنی سوچ کو مرتکز کر دینا چاہیئے کہ ان حالات میں کرنا کیا چاہیئے ؟ اور اس مخمصے سے نجات کی سبیل کون سی ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اگرچہ آئندہ کے حالات اُمورِ غیبی کے ذیل میں آتے ہیں، جن کا کوئی حتمی اور یقینی علم سوائے انبیاءِ کرام کے اور کسی انسان کو نہیں ہو سکتا، اور نبوّت کا دروازہ کلّیتہً اور مستقلاً بند ہو چکا ہے۔ تاہم حالات کی رفتار اور موجود الوقت ظروف و احوال کے تجزیے سے ایک اندازہ ہر سوچنے سمجھنے والا انسان خود بھی قائم کرتا ہے، اور اس ضمن میں دوسروں کی رائے بھی معلوم کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم سے بھی بہت سے رفقاء و احباب نے اس قسم کے سوالات کئے جن کا جواب گفتگوؤں میں بھی عرض کیا جاتا رہا ہے اور اب اختصار کے ساتھ تحریراً بھی پیشِ خدمت ہے۔

ہماری رائے میں صورتِ حال اس سے بہت زیادہ خراب اور مایوس کن ہے جتنی کہ وہ بظاہر نظر آتی ہے۔ اور اس کے باوجود کہ ہمیں نہ صرف یہ کہ جنرل ضیاء الحق صاحب کی نیّت پر کوئی شبہ نہیں بلکہ خدا گواہ ہے کہ ہم انہیں ایک نہایت شریف، دیندار اور مخلص مسلمان سمجھتے ہیں، ہمیں مستقبل قریب میں اصلاحِ احوال کی کوئی امید نظر نہیں آتی اور آئندہ کم از کم دس برس تک تو یہی نظر آتا ہے کہ ہماری ملکی و قومی زندگی کی ناؤ ڈولتے ہی چلے گی۔ بلکہ کوئی عجیب نہیں کہ کسی سقوطِ مشرقی پاکستان ایسے بڑے حادثے سے بھی دوچار ہو جائے!

قومی و اجتماعی سطح پر احتساب کا ہمہ گیر عمل، ترویجِ شریعت کی مبارک و مسعود کوشش اور نظامِ تعلیم کی اصلاح اور تعمیرِ نو ایسے اقدامات جن کے لیے سرتوڑ کوشش اس وقت جنرل ضیاء الحق صاحب کر رہے ہیں، کاش کہ ان کا آغاز قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہو جاتا۔ اُس وقت فضا حد درجہ سازگار تھی اور قلوب و اذہان اس کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے، لیکن افسوس کہ ہم نے نہ صرف یہ کہ وہ موقع کھو دیا بلکہ کوڑے تیس سال بالکل مخالف سمت میں تیزی کے ساتھ دوڑنے میں صرف کر دیئے اور اب جب کہ ایک انگریزی مقولے کے مطابق وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ کر گزر چکا ہے اور حالات بالکل دوسری انتہا کو پہنچ چکے ہیں، ہم اگر جاگے بھی تو اس

جاگنے سے کیا حاصل! — بفحوائے الفاظِ قرآنی: "یَوْمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰی لَهُ الذِّکْرٰی" یعنی — اُس روز ہوش آئے گا انسان کو! لیکن تب ہوش میں آنے کا کیا فائدہ؟، یا بقولِ شاعر ؎: "جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم تھا خزاں کا!"

اِس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ملک وملّت کو اس کے اصل نصب العین سے منحرف کرنے اور قوم کی سیاسی و اجتماعی گاڑی کو پٹڑی سے اُتارنے کے جرم کا اصل مجرم کون ہے؟ وہ قیادتِ عظمیٰ جو اس ملک کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی تھی یا اُس کے وہ حواری اور ہم سفر جن کی اکثریّت کو خود اس نے "کھوٹے سکّوں" سے تشبیہ دی تھی، یا وہ نیم مذہبی و نیم سیاسی جماعتیں جنھوں نے چھوٹتے ہی قصرِ قیادت و سیادت اور ایوانِ حکومت پر ہلّہ بولنا لازمی و ناگزیر سمجھا۔ یا وہ علماء و مذہبی پیشوا جنھوں نے صرف 'تنقید' ہی کو کل فرض سمجھا؟ یا وہ مہاجر جو آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان آئے لیکن یہاں پہنچتے ہی ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی دولت پر بالکل گدھوں کے سے انداز میں لوٹ کر گرے، یا وہ مقامی آبادی جس نے پاکستان کے قیام کو اپنے حق میں بالکل "مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ" کے مترادف جانا اور اِس خوانِ نعمت کی ذمّہ داریوں کی جانب نگاہ ہی نہ کی! — اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ جُرم کسی ایک فرد یا جماعت کا نہیں ہے، اس حمّام میں پُوری قوم اور اُس کے تمام طبقات ننگے ہیں۔ یہ ہمارا وہ اجتماعی جُرم ہے جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک بھگتیں گے! (اِس موضوع پر جناب زیڈ اے سلیری صاحب کے ایک مضمون کا عنوان بڑا ہی پیارا تھا —

("THE LEARNED ALSO FAILED!")

الغرض! — مجرم اور قصوروار خواہ کوئی بھی ہو اس سے اس اصل صورتِ واقعہ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو اس وقت بالفعل موجود ہے — یعنی یہ کہ مادّہ پرستی اور لادینیّت نے سرطان کے پھوڑے کی طرح ہمارے پورے جسدِ ملّی میں گہری جڑیں جما لی ہیں۔ اب سے لگ بھگ دس سال قبل تک مادّیت اور الحاد کو معاشرے کے پڑھے لکھے اور اعلیٰ طبقات کے 'فکری انداز' یعنی INTELLECTUAL CULT کی حیثیّت حاصل تھی لیکن ماضی قریب میں ذرائع ابلاغِ عامّہ (MASS MEDIA) کے طفیل SECULARISATION کا یہ عمل قوم کے انتہائی نچلے طبقات تک نفوذ کر گیا ہے اور عوام کی ایک عظیم اکثریّت کے قلوب و اذہان شعوری یا غیر شعوری طور پر اس زہر سے مسموم ہو چکے ہیں — اب ظاہر ہے کہ "مادیّت" کے

سیلاب کا فطری رُخ "جدلی مادیت" ہی کی جانب ہوتا ہے، لہٰذا آپ چاہیں تو اسے قسمت کی ستم ظریفی (IRONY OF FATE) قرار دے لیں۔ بہرحال واقعہ یہی ہے کہ وہ ملک جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور جسے دَورِ جدید میں اسلام کی ایک تجربہ گاہ بنانا مقصود تھا عوامی سطح پر تیزی کے ساتھ 'خالص مادیت' ہی نہیں 'جدلی مادیت' کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور اگر اس دھارے کا رُخ حقیقی روحانیت اور واقعی خدا پرستی کی طرف نہ موڑا جاسکا تو کوئی سطحی اور مصنوعی تدبیر حالات کی فتار کو نہیں روک سکتی، گویا بقول علامہ اقبال : ؎

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے و لیکن پیرانِ کلیسا کی دُعا ہے کہ یہ ٹل جائے!

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اس عرصے میں مختلف دینی تحریکوں اور مذہبی جماعتوں کے زیرِ اثر قوم کے طبقۂ متوسطہ میں مذہبی رجحان اور شعائرِ دینی کے ساتھ عملی وابستگی میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ 'مذہبیت' اکثر و بیشتر ایک ایسے خالی خول کے مانند ہے جس میں نہ حقیقی رُوحانیت کی چاشنی موجود ہے اور نہ واقعی خدا پرستی اور آخرت طلبی کی رُوح۔ چنانچہ وہ یا تو نری رسم پرستی (RITUALISM) کی حیثیت رکھتی ہے یا صرف ایک عقلی و ذہنی ورزش اور ایک مخصوص تہذیبی اور ثقافتی انداز (SOCIAL CULT) کی، اِلّا ماشاء اللہ!

لہٰذا بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ہمارے یہاں اس وقت اصل تصادم ان ہی نچلے اور متوسط طبقات کے مابین ہے۔ اور ان دونوں طبقوں کے اصل دھاروں (MAIN CURRENTS) کا رُخ بالکل مخالف سمت میں ہوگیا ہے۔ چنانچہ نچلے طبقات تیزی کے ساتھ مادیت، لادینیت اور سوشلزم کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ جبکہ طبقۂ متوسطہ کے فعّال عناصر اسلام اور نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر منظم ہو رہے ہیں، اور خاکم بدہن! ہمارے تجزیے کے مطابق اُن کے مابین ایک فیصلہ کُن تصادم ناگزیر ہو چکا ہے۔ اِس پورے معاملے میں دلچسپ ترین امر یہ ہے کہ سب سے اوپر کا طبقہ فی الحال بندر کے مانند ترازو ہاتھ میں لئے بیٹھا ہے اور دو طرفہ فوائد حاصل کر رہا ہے۔ چنانچہ "غریبوں" کی قیادت کی اجارہ داری بھی اسی کے پاس ہے اور "مذہب" کی سرپرستی کی ٹھیکہ داری بھی!۔ لیکن ہمارا اندازہ یہ ہے کہ یہ 'گھپلا' اب زیادہ دیر نہیں چل سکے گا اور اصل متحارب قوتوں کی یہ صف آرائی (POLARISATION) تیزی کے ساتھ اپنی منطقی انتہا پہنچ کر رہے گی۔ چنانچہ سیاسی جماعتوں اور گروہوں کے مابین بھی ایک بالکل نئی صف بندی (RE-ALIGNMENT) دائیں اور بائیں بازوؤں کی تقسیم اور مرکزیت پسند اور مرکز گریز رجحانات کے تصادم کی بنیاد پر ہوگی۔

ہمائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آج سے چند سال پہلے جب جماعت اسلامی پاکستان (کالعدم) سیاست کی دلدل میں بُری طرح پھنس چکی تھی، کوئی شخص یہ تصوّر بھی نہیں کرسکتا تھا کہ جماعت کے حلقے میں "سیاست بیزاری" کا اظہار بھی ممکن ہے۔ عملی سیاست میں پڑ کر جماعت کے اکابر و اصاغر یہ بات ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ مغربی جمہوریت کے جس تصوّر کو لے کر وہ سیاست بازی کر رہے ہیں اُس کے نتیجے میں اُن کی تمامتر سرگرمیوں کا حاصل سطحی نمود و نمائش، قوّت کے بے جا اظہار اور سلام کو "نظریہ ضرورت" کی حد تک برتنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اُس دَور میں جن لوگوں نے جماعت کے اعیان و انصار کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ:

"انتخابات کے ذریعے عمومی اصلاح کا نظریہ بڑی خام خیالی پر مبنی ہے، بحالاتِ موجودہ تو اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ انتخابات کے ذریعے اصلاح کی اُمید کی جائے۔ ویسے بھی ہمارے رائے میں انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مخالف و مقابل کی حیثیت سے شرکت دعوت و اصلاح کے صحیح نہج کے منافی ہے اور اس سے قبولِ حق کے دروازے بند ہوجاتے ہیں" (قرارداد تاسیس تنظیم اسلامی)

تو "تحریک اسلامی" کے جانثاروں نے انہیں عافیت کوشی، مصلحت پسندی اور سرکار پرستی کا طعنہ دیا جو اسلامی نظام کے نفاذ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

جب جماعت کے کچھ بہترین لوگ علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تو بھی جماعت والے اپنے طریقِ کار یا اندازِ فکر میں تبدیلی لانے پر آمادہ نہ ہوئے اور قومی سیاست ہی کو دین کا تقاضہ اور اسلام کا مدعا و مقصود سمجھتے رہے اور پچھلے دس سال میں تو جماعت سیاست کے کھیل میں کچھ اس طرح سے الجھی کہ اُن جماعتوں سے بھی آگے بڑھ گئی۔ جو ملکی سیاست ہی کو اپنا منتہا و مقصود قرار دیتی ہیں بائیں بازو

کی چند سخت جان جماعتوں نے حقیقتاً سیاست کے دھارے سے ہٹ کر اپنی اُصول پسندی کا ثبوت دینے کی کوشش کی لیکن جماعت اسلامی (کالعدم) ہر چہ بادا باد کے مصداق ہر قیمت پر سیاست کا کھیل کھیلنے پر آمادہ نظر آئی اور بعض اوقات فاؤل بھی کھیل گئی۔ ممکن ہے یہ صورتِ حال مزید کئی سال برقرار رہتی مگر موجودہ فوجی حکومت نے سیاست کو شجرِ ممنوعہ قرار دیکر سیاسیین کو ہوش کے ناخن لینے کی بالواسطہ تلقین کی تو ہمارا اندازہ ہے کہ جماعت کے سیاست زدہ یا یوں کہیئے کہ سیاست میں غرق افراد کو چھوڑ کر ان لوگوں کو جو جوش میں بھی ہوش کا دامن بہت کم چھوڑتے اور ماضی و حال کا جائزہ لے کر اپنی خامیوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر کرنے کے بجائے انہیں دُور کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اپنے گریبان میں جھانکنے، اپنی تیس سالہ بعد از تقسیم ملک (ہندوستان) کارکردگی کا جائزہ لینے اور نفع، نقصان کا اندازہ کرنے کا موقع ملا۔ سیاست کی کساد بازاری نے گہرے غور و فکر کی راہ سجھائی اور ہمیں خوشی ہے کہ اس سوچ بچار کا نتیجہ ترجمان القرآن، جون ۱۹۸۰ء کی اس تحریر کی صورت میں برآمد ہوا"

"پارلیمانی سیاست کی ساری توجہ حالات کے مدّ و جزر پر ہوتی ہے، کون قیادت پر آگیا ہے؟ کسے وزارت مل گئی؟ کیا قوانین پاس ہوگئے، ٹیکس کتنے لگا دیئے گئے؟ داخلی اور خارجی پالیسیاں کیا ہیں؟ وغیرہ"۔

"میرا خیال ہے کہ پچھلے ادوار میں ہماری توجہات کو واقعاتی مدّ و جزر (نے) اپنی طرف اس درجہ منعطف کئے رکھا کہ ہماری ساری گفتگوئیں، بیانات، اعلانات، خط و کتابت انہی کے حوالے سے ہوتی رہی ہے اور انہی کے حل اور توڑ سوچے جاتے رہے ہیں۔ متوازی طور پر جو زور کارِ دعوت پر دیا جانا تھا وہ نہیں دیا جا سکا ہے۔ (چند سطر آگے) یعنی اب ہمارا طریقہ لوگوں کو اسلام کی اصل دعوت کی طرف کھینچنے کا نہیں، بلکہ وقت کے مسائل اور اُن کے حل کی طرف کھینچنے کا ہے۔ ہم یہ تو کہتے ہیں کہ فلاں چیز ہو جائے تو اسلام کا علم بلند ہوگا اور فلاں کو روکا جائے تو اسلام کو نقصان پہنچے گا مگر اب ہم اسلام کی اساسی تعلیم کو لوگوں میں ایسے طریقے سے نہیں پھیلاتے کہ وہ خود یہ بات

سمجھنے کے قابل ہو جائیں کہ اسلام کی قوت کس صورت میں ہے اور اس کا ضعف کس صورت میں ۔ (دعوت اسلامی کا اصل مدعا و مقصود واضح کرنے کے بعد کس قدر واضح انداز میں اعترافِ ناکامی) یہ ہے کارِ دعوت مجھے اندیشہ ہے کہ ہم اس بنیادی کام میں اپنے ہدف سے پیچھے رہ گئے ہوں اور رفتارِ کار کے لحاظ سے سُست گام ہو گئے ہوں،،

جب جماعت کے بزرگوں سے کہا جاتا تھا کہ ۱۹۴۷ء سے قبل جماعت نے خاموشی سے جو کام کیا وہی اصل میں دعوتِ اسلامی کا صحیح طریقہ کار ہے اور ہلڑبازی کی سیاست اور نعروں سے لبریز جوش و خروش سوائے وقتی ہنگامہ آرائی کے کوئی مفید برگ و بار نہیں لایا کرتا تو یہ جماعتی احباب خاصے جزبز ہوا کرتے تھے لیکن اب بڑی صاف گوئی سے کہا جا رہا ہے کہ " حالانکہ جوشیلی تقریریں ہوں یا جلسے جلوس یا پوسٹر یا بیانات یہ ساری چیزیں اظہارِ قوت نمائش قوت کی تعریف میں آتی ہیں .... نمائش قوت سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو مغالطے دیئے جا سکتے ہیں اور کسی معرکۂ مسلسل میں جزوی طور پر مغالطہ انگیزی بھی فائدہ دے جاتی ہے مگر فی الحقیقت مستقل دار و مدار اصل قوت پر ہوتا ہے کہ وہ کتنی ہے ؟"

اس سخن گسترانہ گفتگو کے بعد ترجمان القرآن کی ہوش مندانہ اور خود احتسابی کے جذبے سے معمور تحریر کے زوردار مقطعے میں تو جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ بالکل وہی ہے جو تنظیم اسلامی کے امیر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور ان کے ساتھی گذشتہ پندرہ بیس سال سے کہہ رہے ہیں اور جس پر جماعت اسلامی کے احباب کی نظر میں وہ معتوب بھی ہیں لیکن اس سے پہلے " میثاق" لاہور میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے قلم سے ایک تحریر کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے تاکہ اب تک کی گفتگو سے آپ کوئی نتیجہ اخذ کر سکیں ۔

" اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دل میں ایک بے اختیار سی ہوک اٹھتی ہے جب ہمیں یہ خیال آتا ہے کہ برصغیر کی ایک اچھی بھلی دینی تحریک جو صورتحال کی صحیح تشخیص کے ساتھ ایک بہت حد تک صحیح طریق کار پر برسرِ عمل تھی — وہ بھی قیامِ پاکستان کے وقت، حالات اور مواقع کی ایک وقتی سی ترغیب و

تحریص (TEMPATAION ———) کے زیرِ اثر اپنے موقف سے منحرف اور اپنے نہج کار سے دستبردار ہو گئی اور سطحیت فکر و عمل کا شکار ہو کر وہی خالی خولی نعرے لگانے میں مصروف ہو گئی جن کی شدید مذمت ماضی میں وہ خود کرتی رہی تھی — اور آج جب کہ تقریباً ربع صدی گذر چکی ہے وہ سیاست کے ریگزار میں حکومت و اقتدار کے سراب کے پیچھے بھٹکتی پھر رہی ہے ۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ۔ (تذکرہ و تبصرہ ۔ میثاق ۔ مئی ۱۹۶۹ء)

اب ملاحظہ کیجئے ٹیپ کا بند، ترجمان القرآن کا وہ اقتباس جس نے جماعت اسلامی کی قیام پاکستان کے بعد کی پوری حکمتِ عملی کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں اور جس کے بعد جماعت کے رہنماؤں اور بالخصوص اُن لوگوں کی خدمت میں جو جماعت کا فکری سرمایہ تصوّر کیئے جاتے ہیں ۔ یہی عرض کیا جا سکتا ہے

ع ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

”خالص نظریاتی بات یہ ہے کہ سیاست جو بجائے خود ضروری ہے، ایک طرح کی محاذ آرائی ہوتی ہے ۔ ہم خیال لوگ ایک طرف اور مخالفین ایک طرف دونوں طرف سے بیان بازی، دونوں طرف سے جوڑ توڑ، دونوں طرف سے چالیں اور ان کی کاٹ اس مشغلے کا مزاج جنگی ہے ۔ سیاست کے اسٹیج سے آدمی نرم اور ڈھیلی ڈھالی بات نہیں کر سکتا ۔ وہ اس طرح کا انداز اختیار نہیں کر سکتا کہ ”ممکن ہے غلطی ہماری ہو، مگر ہمیں صحیح یہی محسوس ہوتا ہے“ کھینچا تانی جب بڑھتی ہے تو نفرت کی سپرٹ کام کرنے لگتی ہے ۔ آپ سٹیج سے جسے حریف قرار دے کر اس پر گولہ باری کرتے ہیں پھر اسی سیاسی سٹیج سے اُسے دلگداز انداز میں دعوتِ اسلامی نہیں دے سکتے، دیں بھی تو عبث ہے . . . . . . میں کہتا ہوں کہ سینکڑوں سیاسی کامیابیاں اور ہزاروں سیاسی فتوحات اس جدوجہد پر قربان جس کے نتیجے میں خدا کے بندے، نفس اور ماحول کی قوتوں کی بندگی سے نکل کر صحیح معنوں میں خدا کے بندے بن جاتے ہیں یہی اقامتِ دین کی جدوجہد کی اصل قوّت ہوتے ہیں اور اصل قوّت میں اضافہ کرنے کی مہم ہر قسم کے حالات میں جاری رہنی چاہیئے ۔“

(اشارات ۔ ترجمان القرآن جون ۱۹۸۰ء)

حالانکہ جماعت کے ان فرزانوں کو کون سمجھائے کہ بالکل یہی باتیں دردمندانہ انداز میں چوبیس سال قبل ایک "دیوانے" ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کہتے رہے اور جماعت والوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی ۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف ماچھی گوٹھ کے اجتماع ۱۹۵۷ء میں یہ قرارداد پیش کی ؛

میں تجویز کرتا ہوں کہ جماعتِ اسلامی پاکستان کا یہ اجتماعِ ارکان حسبِ ذیل قرارداد پاس کرے ۔

"جماعتِ اسلامی پاکستان کا یہ اجتماعِ ارکان بہت سوچ و بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اگرچہ جماعت نے پچھلے پندرہ سالوں میں اپنے نصب العین سے اصولاً انحراف نہیں کیا ہے لیکن ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں نظامِ اسلامی کے قیام کے لئے جو طریقِ کار جماعت نے اختیار کیا تھا اور جس پر جماعت تا امروز عمل پیرا ہے وہ مجموعی طور پر اس طریقِ کار سے بالکل مختلف ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی ۔ یہ طریقِ کار اپنے سابقہ طرزِ عمل سے مختلف بلکہ متضاد ہونے کے علاوہ پاکستان کے عوام اور اس کے برسرِ اقتدار طبقے کے بارے میں کچھ ایسی خوش فہمیوں اور خود جماعت کی طاقت و وسائل و ذرائع کے بارے میں ایسے اندازوں پر مبنی تھا جو بعد میں کلیتہً درست ثابت نہ ہو سکے ۔ اس طریقِ کار کے تحت ساڑھے نو سالہ جدوجہد کا منفی طور پر یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا ہے کہ کوئی اور نظام بھی اس ملک میں اپنی جڑیں گہری نہیں جما سکا لیکن مثبت طور پر نظامِ اسلامی کے قیام کے لئے جو کچھ کیا جا سکا ہے وہ اس طویل اور انتھک جدوجہد کے مقابلے میں بے حد کم ہے کہ جو ان نو سالوں میں جماعت کو کرنی پڑی ہے ۔ اس جدوجہد کا ماحصل دستور میں شامل شدہ چند کمزور اور مترلزل اسلامی دفعات اور صرف مسئلہ دستور پر اس ملک کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اسلامی نقطۂ نظر سے علمی راہنمائی کے سوا کچھ نہیں ۔ اس عرصے میں نہ تو عوام کی

اسلامی نقطۂ نظر سے ٹھوس فکری و ذہنی تربیت کی جا سکی ہے نہ اخلاقی و عملی، اور اس معاملے کا دردناک ترین پہلو یہ کہ اس طریق پر جدوجہد کے دوران جماعت کو نہ صرف اپنے کارکنوں کے سرمایۂ دین و اخلاق اور متاعِ خلوص و للّٰہیت کے ایک حصّے کا ضیاع برداشت کرنا پڑتا ہے بلکہ اسے خود اپنی بین الاقوامی، اصولی، اسلامی جماعت ہونے کی حیثیت سے ہاتھ دھو کر ایک اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کی حیثیت اختیار کر لینی پڑتی ہے۔

موجودہ طریق کار کے غلط ہونے کے علاوہ جماعت کا یہ اجتماعِ ارکان یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے مطابق جدوجہد کو آئندہ جاری رکھنے کی صورت میں جماعت کو جو خطرات پیش آسکتے ہیں وہ ان تمام نتائج و خدشات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں جو اس طریق کار کو چھوڑ کر سابق طریق کو اختیار کرنے میں پیش آسکتے ہیں۔

بنا بریں جماعت کا یہ اجتماع محسوس کرتا ہے کہ موجودہ طریق کار کو اسی لمحہ ترک کر کے اسی طریق کار کو اصولاً دوبارہ اختیار کرنے ہی پر جماعت کی اخروی و دنیوی فوز و فلاح کا دار و مدار ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی۔ چنانچہ یہ اجتماع فیصلہ کرتا ہے کہ ماضی کے بارے میں اس نقطۂ نظر اور مستقبل کے بارے میں اس فیصلے کو اصولاً تسلیم کرنے کے بعد اس کے مطابق آئندہ کا لائحہ عمل تجویز کرنے کے لئے جماعت کے اربابِ حل و عقد جمع ہو کر سوچ بچار کریں اور ایک تفصیلی لائحہ عمل مرتب کر کے اس اجتماع کے سامنے پیش کریں۔"

بلکہ تنظیم اسلامی قائم کی تو اس کے ابتدائی اجلاس میں یہ حقیقت واضح کی گئی کہ: "ارباب اقتدار کی ہر بات کو ہدف تنقید بنا لینا یہاں تک کہ اُن کے خیر کو بھی شر قرار دینا اور اُن کی مخالفت میں اس حد تک آگے بڑھ جانا کہ دوسروں کی برائیاں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رو سے جائز ہے، نہ

اسلام کی رو سے - یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحیح بات بھی اربابِ اقتدار کو اپیل نہیں کرتی،، (قرارداد تاسیس مع توضیحات حصہ اوّل تنظیم اسلامی صـ۲۲)

اے کاش کہ اب بھی کالعدم جماعت اسلامی کے بزرگ اپنے سابقہ اور موجودہ طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کریں - ہماری نہ سہی جناب نعیم صدیقی صاحب (جو ترجمان القرآن کے "اشارات" لکھتے ہیں) کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنے کی زحمت گوارا کر لیں اور نعیم صدیقی صاحب نے جو تجزیہ کیا ہے اور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جو باتیں بیس سال سے کہہ رہے ہیں، اس سے اتفاق کرتے ہوئے اس دلدل سے نکلنے کی سعی کریں جس میں پھنس کر وہ اپنی منزل ہی کھوٹی نہیں کر بیٹھے بلکہ اپنے نظریاتی تشخص سے بھی محروم ہو گئے ہیں - اے کاش —

میثاق شمارہ مئی ۱۹۸۰ء (نشر القرآن) میں ایک غلطی کی نشاندھی

جناب جسٹس ظہور الحق صاحب جج - سندھ ہائی کورٹ کراچی کا گرامی نامہ:-

مکرمی بندہ، سلام علیکم -

آپ کے ماہنامہ برائے مئی ۱۹۸۰ء کو دیکھا - جزاک اللہ - ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے سورہ توبہ کی تفسیر نہایت ایمان افروز طریقے سے فرمائی - اللہ سب مسلمانوں کو نفاق سے محفوظ رکھے -

اسی ماہنامہ کے صفحہ ۴۲ پر سورۃ منافقوں کی پہلی آیت کے نقل کرنے میں کاتب سے تقصیر ہو گئی اس کی تصحیح کرا دیں - "وَاِنَّهٗ لَيَشْهَدُ" کے بجائے اعلیٰ "وَاللّٰهُ يَشْهَدُ" صحیح ہے - واللہ اعلم -

ہم معذرت خواہ ہیں کہ پوری احتیاط کے باوجود "میثاق" مئی ۱۹۸۰ء میں کتابت کی غلطی رہ گئی - توجہ دلانے پر ہم جناب جسٹس ظہور الحق صاحب کے شکر گذار ہیں -
ایڈیٹر "میثاق"، لاہور

والسلام
فقیر الی اللہ
(دستخط) ظہور الحق
نمبر ۱۳۳ برنٹو روڈ
کراچی

۴ر جولائی ۸۰ء

امریکہ سے ایک خط

محترم جناب ڈاکٹر اسرار بھائی، سلام علیک

پہلی بار خط لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا لیکن نہ لکھ سکا۔ سمیع اللہ صاحب (ٹورنٹو) سے برابر آپ کے پروگرام کی خبر ملتی رہتی ہے اور الحمدللہ آپ کے دوبارہ آنے کی خبر سے بڑی مسرت ہوئی۔ خدا کرے آپ کا پروگرام کامیاب ہو۔ دین کی آپ جو خدمت کر رہے ہیں اس کا اجر اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے خاندان کو ضرور دے گا انشاءاللہ۔ بلکہ دوسرے جو لوگ آپ کے ساتھ اس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں انہیں اس سے زیادہ نیک کام اور کون سا کرنے کو مل سکتا ہے۔

پچھلی دفعہ آپ سے اتنی سرسری ملاقات ہوئی کہ بہت سی باتوں کو جاننے کا موقعہ ہی نہ مل سکا۔ ٹورنٹو (کناڈا) میں دیئے گئے آپ کے درس کے TAPE سمیع اللہ صاحب نے بھیج کر مجھ پر بڑا احسان کیا —— چھ ماہ ہونے کو آئے، جب سے TAPE ملے ہیں، یقین جانئے روزانہ سنتا ہوں۔ ان کی بہت سی کاپیاں بنا کر دوسروں کو دی ہیں۔ خاصی بڑی تعداد میں لوگ ان سے متاثر ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمیں قرآن حکیم عطا فرمایا اور آپ نے ہماری زبان میں اس کی تشریح کر کے ہم پر بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

باتیں تو اتنی لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ ختم نہ ہوں لیکن آپ کی مشغولیت کا اندازہ کر کے چند ضروری باتوں پر اکتفا کر رہا ہوں اُمید ہے آپ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت نکال کر اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں گے۔

(۱) آپ کا بھیجا ہوا پرچہ "میثاق" ملا تھا۔ میری بدقسمتی کہ میں نے اس کا ہدیہ روانہ کر کے جاری نہیں کرایا۔ اگر گستاخی نہ ہو تو آپ اُسے جاری کرا دیں۔ میں سال کا چندہ روانہ کر دوں گا۔ انشاءاللہ۔

(۲) آپ کا پروگرام شکاگو میں انشاءاللہ ۱۲ ستمبر جمعہ کے دن سے شروع ہوگا۔ جمعہ کی نماز آپ MUSLIM COMMUNITY CENTRE میں پڑھائیں

گے اور اسی دن مغرب سے عشاء تک پہلا درس ہوگا۔ سینچر کے دن درس ظہر کی نماز کے بعد سے ہوگا۔ شام کے وقت FUND RAISING DINNER ہے جس میں تقریباً ہزار کے لگ بھگ لوگ ہوں گے۔ آپ سے گذارش ہے کہ اس میں ایک گھنٹہ کا خطاب فرمائیں جس کا آئندہ درسوں کی حاضری پر انشاء اللہ اچھا اثر پڑے گا۔ اس طرح WORKING DAYS میں درس شام کے وقت اور WEEK END میں دن کے وقت ہوا کریگا۔ مسلمانوں کی جو جماعتیں شکاگو اور اس کے مضافات SUBURBS میں ہیں وہاں آپ کا پروگرام WEEK ENDS پر درس کے وقت کے علاوہ دوسرے اوقات میں رکھا جائے گا۔ انشاء اللہ ہم ابھی سے آپ کے پروگرام کے سلسلہ میں لوگوں کو باخبر کرنا شروع کر رہے ہیں

(۳) یہاں پر ریڈیو اسٹیشن سے اسلامی جرنل کے نام سے بدھ کی شام کو ایک گھنٹہ کا پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ اس پروگرام میں ایک دو دفعہ آپ کے درس کے ٹیپ بھی سنائے گئے تھے۔ لیکن چونکہ وقت کم ہوتا ہے اور بات ایک دفعہ میں پوری نہیں ہو پاتی اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ اگر ممکن ہو تو ۱۶ منٹ کا ایسا ٹیپ، جو آپ نے ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر کیا تھا، ہمیں بھجوا دیں تاکہ ۱۶ منٹ کا پروگرام یہاں سے بھی نشر ہو سکے۔

(۴) آپ نے جو درس پچھلے سال ٹورنٹو میں دیتے تھے، اس کے TAPE یہاں آچکے ہیں اور بہت سے لوگ انہیں سن چکے ہیں خود میں نے تقریباً ۵ یا ۶ مرتبہ سنا ہے اور سنتا رہتا ہوں۔ اس لئے براہ کرم وہی درس یہاں پر نہ دیں بلکہ دوسرے درس ہوں تاکہ ہمارے علم میں اضافہ ہو۔

(۵) انجمن خدام القرآن کی ایک برانچ یہاں شکاگو میں کھولنے پر غور کریں۔ یہاں پر کافی لوگ کام کرنے کے لئے تیار ہیں اور مجھ سے جو کچھ ممکن ہوگا انشاء اللہ کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔

(۶) اپنی کتابوں کے ایک سویٹ، جیسے آپ نے ٹورنٹو، سمیع اللہ صاحب کو

روانہ فرمائے تھے، ہمارے پاس بھی روانہ کریں تاکہ یہاں پر درس کے موقعہ پر کام آسکیں۔

آپ شکاگو میں میرے مہمان ہوں گے اور انشاء اللہ آپ کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔ ایک خوشخبری سناتا ہوں جو آپ کے TAPE کے سننے کے اثر سے پیدا ہوئی۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنا مکان جو بنک کے قرض پر خریدا گیا تھا، دو ۲ ماہ ہوئے سارا قرض بنک کو ادا کر کے بالکل حلال کر دیا اور اس بار انشاء اللہ آپ حلال مکان میں ٹھیریں گے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب میں کسی طرح بھی سود کے پنجے میں نہیں ہوں اور دوسروں کو بھی اس سے پرہیز کا مشورہ دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ مجھ میں نیکی کا یہ جذبہ آپ کا درس سننے سے پیدا ہوا۔

اردو میں خط لکھنے کا موقعہ بہت کم ملتا ہے اس لئے خط کے پڑھنے میں کوئی دشواری پیش آئے تو معاف چاہتا ہوں۔ بیگم، والدہ اور دوسرے تمام لوگ سلام علیک کہتے ہیں۔ تمام لوگوں کو سلام علیک۔

آپ کا بھائی

(ڈاکٹر خورشید ملک

شکاگو (امریکہ)

عن عبداللہ بن عمرؓ۔ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

السمع والطاعۃ

علی المرء المسلم فیما احب وکرہ مالم یؤمر بمعصیۃ

فاذا امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ (متفق علیہ)

درسِ حدیث

لذّتِ ایمان

از قلم : مولانا محمد حسین میر، اُستاذ عربی، قرآن اکیڈمی

عن عباس بن عبد المطّلب، قال، قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربّا وبالاسلام دینا و بمحمّد رسولاً ط

ترجمہ :" حضرت عباسؓ بن عبد المطّلب سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا : ایمان کا مزا اس شخص نے چکھا جس نے اللہ کو بطورِ ربّ، اسلام کو بطورِ دین اور حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بطورِ رسول پسند کیا!"

کسی لذیذ و شیریں چیز کو دو شخص نوشِ جاں کرتے ہیں۔ ایک وہ شخص جس کے اعضائے اکل و شرب کا اعصابی نظام ماؤف ہوچکا ہو اور قوّتِ ذائقہ سے تعلّق رکھنے والی اس کی تمام حسّیات مردہ ہوچکی ہوں۔ بے شک ایسا شخص اس چیز کو حلق سے نیچے اتار لے گا، اپنا پیٹ بھی بھر لے گا اور اُس کی اشتہاء کی تسکین بھی ہوجائے گی۔ مگر وہ کیفیت جسے لذّتِ کام و دہن سے تعبیر کرتے ہیں، اسے حاصل نہیں ہوسکے گی۔ اس کے لئے تلخ و شیریں دونوں برابر ہیں، اُسے نہ اِس سے کوئی کیف و سرور حاصل ہوگا نہ اُس سے کوئی تکدّر و تنفّر ——— !!

دوسرا وہ شخص جس کی قوّتِ ذائقہ نہ صرف قائم و صحیح ہو بلکہ لطیف و حسّاس بھی ہو۔ وہ جب کسی لذیذ و شیریں چیز کو نوشِ جاں کرے گا تو صرف کام و دہن ہی نہیں بلکہ اس کے جسم و جاں کا رُواں رُواں اس کیفیتِ تلذّذ کو اس طرح محسوس کرے گا کہ یہ احساس بشاشت و انبساط بن کر اُس کے چہرے سے جھلکنے لگے گا۔ ظاہر ہے کہ اسی قسم کے لوگ ہیں جو تلخ و شیریں کے درمیان امتیاز کرسکتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو لذیذ و شیریں اشیاء کی لذّت و شیرینی سے واقعۃً لطف اندوز ہوتے ہیں ؛

کچھ ایسا ہی معاملہ ایمان کا بھی ہے۔ ایک ایمان ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اسلام کے

سیلاب کو اُمنڈتے دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ اب اس کے سامنے کوئی بند باندھنا ممکن نہیں ہے گردنیں ڈال دیں اور اعلان کر دیا کہ : اٰمنّا باللّٰہ وبالیوم الاٰخر، ونشھد انک لرسول اللّٰہ ط — مگر یہ صرف حلق سے نیچے اتارنے اور پیٹ بھرنے والی بات تھی، ورنہ جب بھی اہل اسلام کو دشمنوں کے ساتھ خلوت میسّر آتی کہتے کہ : اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ ۝ — یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بھی ان کے اِدّعائے ایمان کے فوراً بعد صاف صاف کہہ دیا کہ : مَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ، اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ ۝ —!!

اسی طرح کچھ وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو خدا اور اُس کے رسولؐ پر ایمان اپنے آباء و اجداد سے ورثہ میں ملتا ہے۔ وہ صرف اس لئے مسلمان کہلاتے ہیں کہ انہوں نے بچپن ہی سے اپنے بڑوں کو اللہ، رسول اور اسلام کا نام تعظیم کے ساتھ لیتے سُنا تھا۔ والدین نے انہیں اسلام کی خوراک دی، انہوں نے اپنے پیٹ میں اتار لی، اور اگر انہوں نے انہیں کسی اور قسم کی خوراک دی ہوتی تو انہیں اس کے نگلنے میں بھی دریغ نہ ہوتا۔ یا اگر وہ کسی پادری یا کسی اور مذہب والے کے ہتھے چڑھ گئے اور اس نے ذرا ڈھنگ سے عیسائیت وغیرہ کی گولی کھانے کو دے دی تو اسے بھی نگل گئے۔ نہ انہیں پہلی خوراک میں کوئی لذّت محسوس ہوئی نہ دوسری میں کوئی تلخی و ناگواری —!!

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے قلب و رُوح کی گہرائی میں یہ احساس و شعور اُتر جاتا ہے کہ ہمارا وجود کسی اتّفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارا ایک پیدا کرنے والا ہے جس نے ہمیں بالارادہ اور ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ زمین اور اس کے لامحدود خزانے، یہ آسمان کی نیلگوں وسعتیں، یہ سورج اور اس کی گرمی، یہ چاند اور اس کی روشنی، یہ آبِ حیات سے لدے بادل، یہ سمندر بدوش ہوائیں، یہ بحرہائے ناپیدا کنار سب اس کی صنّاعی کے نمونے ہیں۔ وہ جب غور کرتے ہیں کہ کائنات کا یہ اتنا وسیع نظام کس طرح ریاضیاتی اصولوں کی سی صحّت کے ساتھ نامعلوم کب سے چل رہا ہے اور اس میں لمحہ بھر کے لئے بھی کوئی ذرا سا اختلال واقع نہیں ہوتا تو وہ اس کی قدرت کی وسعتوں میں گم ہو جاتے اور ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ اللہ کی خلّاقی و صنّاعی حکمت و تدبیر اور اس کی بے مثال قہر و ہیبت کے سامنے ان کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور اُن کے دل کی

گہرائیوں سے یہ یقین ابھرتا ہے کہ واقعی اللہ جہاں خلّاق و صنّاع ہے وہاں حکیم و علیم اور مدبّر و قیّوم بھی ہے۔ بلا ریب وہ ربِّ کائنات ہے اور ہم سب اُس کے بندے ہیں اس احساس کے بعد وہ اللہ کے ہر حکم اور اس کے ہر فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ اس کے بعد ان کی پیشانی کسی اور کے سامنے جھکے، یا کسی اور کو وہ اپنا حاکمِ مطلق خیال کریں، یا کسی اور کے سامنے اُن کا دستِ سوال دراز ہو۔

وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ جس طرح اس ربّ العالمین نے ہماری جسمانی و مادّی ضرورتوں کے لئے زمین و آسمان کو طرح طرح کے سامانِ زندگی ہی سے نہیں بلکہ اسبابِ تعیّش و تنعّم سے بھر دیا ہے، اسی طرح اُس نے ہماری روحانی و تمدّنی ضرورتوں کو پورا کرنے کا سامان یوں کیا کہ اپنے برگزیدہ بندے حضرت محمّد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اسلام کے نام سے ایک دین اور بہترین ضابطۂ حیات دے کر بھیجا۔ اسی سے ہماری اس دنیوی زندگی میں سکون اور چین آ سکتا ہے، اور اسی پر عمل پیرا ہو کر ہم آخرت میں بھی آرام و راحت پا سکتے ہیں۔ وہ اسلام کو محض تقلیداً قبول نہیں کرتے بلکہ وہ زندگی کے متعلق جو زاویۂ نگاہ دیتا ہے، اُسے علیٰ وجہ البصیرت اپناتے اور اس کے نظامِ اعمال و احکام میں مضمر حکمتوں اور مصلحتوں کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ دُنیا کے مختلف معاشروں میں کارفرما فلسفوں اور نظامہائے حیات اور ان سے پیدا ہونے والے فساد اور بگاڑ پر بھی اُن کی نظر ہوتی ہے۔ وہ انسانی سوچ پر مبنی ہر فلسفہ و ضابطۂ حیات کو باطل یقین کرتے ہیں پھر وہ اپنے آپ کو دل و جان سے اس سانچے میں ڈھال لیتے ہیں جس میں اسلام بطورِ دین اُن کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ بات کبھی اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتی کہ اس دین میں سے کچھ حصّہ جو اُن کے مفادات یا خواہشِ نفس کی تسکین کرتا ہو، اسے تو قبول کر لیں اور دوسرے کو ردّ کر دیں ؛

ان لوگوں کا حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم کو ماننا بھی عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اللہ کو اپنا ربّ اور اسلام کو دین و دُنیا کی فلاح پر مشتمل ایک دین تسلیم کر لینے کے بعد جب وہ دیکھتے ہیں کہ خدا کے ایک بندے نے، اُس کی یہ نعمت ہم تک پہنچانے کے لئے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں۔ وہ دُنیا کا شریف ترین انسان تھا مگر محض انسانوں کی بھلائی کی خاطر دربدر کی خاک چھانتا رہا۔ طعنے سُنے، گالیاں کھائیں، الزامات اپنے سر لئے، تین سال تک معصوم بچّوں کے ساتھ بھوکا اور پیاسا محاصرے میں رہا۔ ایذا رسانی کا کوئی ممکن

حربہ ایسا نہ تھا جو اُس پہ اور اُس کے ساتھیوں پر آزمایا نہ گیا ہو۔ اُس کے قتل کے منصوبے بنائے گئے، اُس کو اپنے ساتھیوں سمیت نہایت بے کسی کے ساتھ وطن سے نکل جانے پہ مجبور کر دیا گیا، وہ امن پسند تھا اور انسانی خون بہتے دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا مگر اُسے جنگ پہ مجبور کر دیا گیا، اُسے ساری زندگی سکون کی نیند سونے نہ دیا گیا۔ ان تمام مشکلات کے سامنے وہ پہاڑوں کے سے بلند و مضبوط عزم اور سمندروں سے زیادہ وسیع حوصلہ کے ساتھ ڈٹا رہا۔ اگر اُس نے اِن تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا تو فتح و کامرانی کے وقت وہ کسی نشے سے مدہوش نہیں ہوا۔ اُس کی فروتنی کا یہ عالم تھا کہ عرب کے مرکزِ سیاست میں فاتحانہ داخلے کے وقت اُس کا سرِ شکرِ خدا میں جھکا ہوا تھا۔ مسلسل تیئیس سال تک آگ پر تڑپانے والے جب مقہور و مغلوب ہو کر اُس کے سامنے آئے تو اس کے چہرے پر انتقام یا غیظ و غضب کی ایک سلوٹ بھی نہ تھی۔ اُس نے بیک جنبشِ لب سب کو معاف اور آزاد کر دیا۔ اُس کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ پورے عرب کا بلا شرکتِ غیرے حکمران بن جانے کے بعد بھی وہ مٹی کے گھروندے میں رہتا ہے، کھردری چارپائی پر لیٹتا ہے۔ اسبابِ آسائش پہ قدرت کے باوجود اُس نے ساری زندگی نیم فاقہ کشی میں گذار دی۔ وہ مزدوروں میں مزدور بن کر اینٹیں ڈھوتا اور خندقیں کھودتا رہا۔ اُس نے زندگی بھر کسی سے اپنا انتقام نہ لیا، مگر اپنے آپ کو بھرے مجمع میں انتقام کے لئے پیش کر دیا۔ اُس کا عدل و انصاف اتنا بے لاگ تھا کہ اُس میں اُس نے اپنوں تک کا لحاظ نہ کیا۔ وہ جب تک جیا، اہلِ عالم کے لئے رحمت بن کر جیا، اور جب دُنیا سے رخصت ہوا تو بیمار انسانیت کو پیغامِ شفا دیتا گیا۔ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم)

ناممکن ہے کہ حضرت محمد صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی زندگی کے اس پہلو سے مطالعہ کرنے اور آپؐ کو خدا کا آخری رسول یقین کر لینے والوں کی نگاہیں کسی اور شخصیت کی طرف اُٹھ سکیں۔ آپؐ کے سامنے تاریخ کے بڑے بڑے نام نہاد فلاسفر اور رہنما بھی بونے نظر آتے ہیں۔ اس محسنِ انسانیت کی زندگی ہی ان کا IDEAL بن جاتا ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو کلیتًہ آپ کے اُسوۂ حسنہ میں رنگ لیتے ہیں ــــ اللّٰہ کو بطورِ ربّ، اسلام کو بطورِ دین اور آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کو بطورِ رسول پسند کرنے کی یہی وہ کیفیت ہے جسے حضورؐ نے بڑے بلیغانہ اسلوب میں ایمان کا مزا چکھنے سے تعبیر فرمایا ہے:

اللّٰھم ارزقنا ان نرضیٰ بک ربًا و بالاسلام دینًا و بعبدک محمدٍ رسولًا وادن عنا۔

کشتیٔ نوح علیہ السلام

تحریر: شاہد مظفر (بشکریہ روزنامہ نوائے وقت)

کشتیٔ نوح کا تذکرہ قرآن حکیم کے علاوہ دوسری مذہبی کتابوں میں بھی موجود ہے بیشتر ممالک کے متعدد لوگوں کا دعویٰ ہے کہ پانچ ہزار سال پرانی یہ کشتی آج بھی صحیح سالم حالت میں سطح سمندر سے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر مشہور برف پوش کوہ اراراٹ سیمیں کے آغوش میں موجود ہے۔

۱۸۸۰ء میں کل ڈیس جیمز بغداد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمائندہ تھا اس نے اپنی تصنیف "کرستان میں قیام" کی جلد دوم میں بیان کیا ہے کہ حسین آغا نامی ایک شخص کوہِ "اراراٹ" پر واقع عیسائیوں کے راستہ سے گزرتا ہوا تقریباً ایک گھنٹہ میں اسی کشتی کے پاس پہنچ گیا۔ کشتی کی بناوٹ، لمبائی چوڑائی اور اونچائی کا اندازہ لگا کر اس شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ یہی کشتیٔ نوح ہے۔

۱۸۸۲ء میں حکومتِ ترکی نے ایک تحقیقاتی کمیشن "کوہِ اراراٹ" کی طرف روانہ کیا۔ اس دور میں اچانک غیر متوقع طوفان آجانے سے پہاڑ کے گرد و نواح کے بیسیوں گاؤں تباہ ہو جاتے تھے۔ اس کمیشن کا مقصد طوفان کے اسباب معلوم کرنا تھا۔

جب یہ جماعت پہاڑ پر چڑھتی ہوئی چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچی تو ایک جھیل کے کنارے برف میں دبی ہوئی اس عظیم الشان کشتی کا ایک سرا نظر آیا۔ لیکن یہ لوگ کشتی کے اندر زیادہ دور تک نہ جا سکے، کیونکہ اس کا زیادہ تر حصہ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔

انیسویں صدی ہی کے آخر میں مالابار (جنوبی ہند) کے رہنے والے نوری نامی ایک پادری نے جو ان دنوں ایران اور کرستان کے علاقوں میں سیاحت کر رہا تھا کشتیٔ نوح کا سراغ لگانے کا ارادہ کیا۔ تین مرتبہ کی پے بہ پے ناکام کوششوں کے بعد بالآخر چوتھی مرتبہ کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ قدیم کتب میں کشتیٔ نوح کے تذکروں کے مطابق بابل کے تباہ شدہ

شہر سے تقریباً پانچ سو میل کے فاصلے پر اس نے کوہِ اراراٹ پر اس کشتی کو موجود پایا۔

کوہِ اراراٹ کی بلندی سطحِ سمندر سے سترہ ہزار فٹ ہے۔ چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر برف گرنا شروع ہو جاتی ہے۔ نوری لکھتا ہے کہ چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر پانچ ہزار سال پرانی تاریخی کشتی میری آنکھوں کے سامنے تھی، اس کا نصف حصّہ جھیل میں تھا اور بقیہ نصف برف سے ڈھکا ہوا تھا۔

پہلی نظر میں ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کشتی ایک چھوٹا سا غیر آباد قصبہ ہو۔ میں نے کشتی کی پیمائش کی اور اس کی توریت میں لکھی ہوئی لمبائی چوڑائی اور اونچائی کے عین مطابق پایا۔ یہ کشتی ۵۲۵ فٹ لمبی ۸۷ فٹ چوڑی اور ½ ۵۲ فٹ اونچی ہے۔ نوری کے بیان کے مطابق پانچ ہزار سال گزر جانے کے باوجود ابھی تک وہ اچھی حالت میں ہے۔

نوری ایک قابلِ اعتماد شخص تھا، اُس کا تعلق اپنے عہد کے ایک مشہور اور معزز خاندان سے تھا۔ ایک سو کے قریب خطابات پانے والے اس پادری کو بارہ زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اس نے برما، چین، افریقہ، آسٹریلیا اور یورپ کے کئی ممالک کی سیاحت کے علاوہ وہاں کے حکمرانوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ آذر بائیجان اور آرمینیا کی سیاحت و قیام کے دوران پادری فریڈرک نے تین ماہ تک اس کی میزبانی کی۔ پادری فریڈرک تہِ دل سے اس کا معترف اور قدر دان تھا۔

شکاگو کے عالمی میلہ کی ایک مذہبی کانفرنس میں بھی نوری نے شرکت کی۔ کانفرنس کے اختتام پر اس نے کیلی فورنیا کا دورہ کیا لیکن لوگوں نے اس کی زبانی کشتیٔ نوح کی بازیافت کی کہانی پر زیادہ اعتبار نہ کیا۔ ان کے خیال میں یہ ممکن نہیں تھا کہ پانچ ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی چودہ ہزار فٹ بلند پہاڑ پر کشتی صحیح سلامت موجود ہو۔ آخر کچھ مخالفین نے دو ڈاکٹروں کی مدد سے سازش کر کے نوری کو پاگل خانے بھجوا دیا، جہاں سے اس کی ایک مداح خاتون نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسے رہائی دلوائی۔

دونوں عالمی جنگوں کے درمیانی وقفوں میں امریکہ کے ایک اخبار "گنگنہ ہیرالڈ" میں کشتیٔ نوح کے متعلق ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کا راوی ایک روسی ہوا باز پراوسکو ولتسکی تھا۔ رپورٹ کے مطابق انقلابِ روس سے کچھ عرصہ قبل روسی ہوا بازوں کا ایک چھوٹا سا دستہ کوہِ اراراٹ سے ۲۵ میل کے فاصلے پر واقع ایک عارضی ہوائی اڈے میں مقیم تھا۔ ولتسکی کو تجرباتی پرواز کے لئے جہاز نمبر ۷ میں بلندی پر اڑانے کا حکم ملا، اُس کے ساتھ معاون ہوا باز بھی تھا۔ وہ

دونوں فضا میں چکّر لگاتے لگاتے چودہ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ گئے۔ ان کے جہاز کا رُخ کوہِ ارارات کی طرف تھا۔ اور وہ پہاڑ کے ساتھ ساتھ پرواز کر رہے تھے کہ انہیں ایک نیلگوں جھیل نظر آئی۔ چاروں طرف سفید برف جمی ہوئی تھی اور وسط میں یہ جھیل نیلم کے مانند چمک رہی تھی۔ ان کا جہاز جھیل کے اوپر سے گزر رہا تھا تو اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے جھیل کے کنارے ایک عظیم کشتی دیکھی۔

کشتی کا بالائی حصّہ گول تھا اور عرشہ پر ۵ فٹ چوڑا ایک پل بنا ہوا تھا، انہوں نے پرواز نیچی کر کے دیکھا تو کشتی کا چوتھائی سے زیادہ حصّہ زیرِ آب تھا اور وہ ایک جانب سے شکستہ بھی ہو چکی تھی۔ دوسری طرف تقریباً بیس مربع فٹ کا ایک دروازہ تھا۔ وتسکی اور اس کا ساتھی جب اپنے اڈّے پر واپس پہنچے تو انہوں نے اپنے اس واقعہ کا تذکرہ اپنے کپتان سے کیا۔ کپتان خود جہاز لے کر جھیل کے قریب پہنچا اور واپسی پر اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ دراصل یہی کشتیٔ نوح ہے جس کا تذکرہ تمام قدیم کتابوں میں اب تک موجود ہے۔

کپتان نے اس دریافت کی اطلاع اپنے محکمے کے ذریعے زارِ روس کو بھیجی اور زار کے حکم پر فوراً ایک تحقیقاتی جماعت مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوگئی۔ اس جماعت نے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک کشتیٔ نوح کے قریب قیام کیا، اور اُس کی پیمائش کر کے اس کا بخوبی جائزہ لیا۔ اور مختلف فوٹو بھی اتارے۔ کشتی میں جو لکڑی استعمال کی گئی تھی وہ صرف قبرص کے جنگلات میں دستیاب ہوتی ہے۔ اس کے پالش میں چکنا ہٹ کی آمیزش کافی تھی اور پانچ ہزار برس گزر جانے کے باوجود اس میں چمک باقی تھی۔ نیچے کے کمرے کافی کشادہ اور بڑے تھے اور ان میں دو دو فٹ موٹے لکڑی کے جنگلے لگے ہوئے تھے جو غالباً ہاتھیوں اور دیگر عظیم الجثّہ جانوروں کے لئے بنائے گئے تھے۔ اوپر کے حصّے میں جالی دار خانے بنے ہوئے تھے جو شاید پرندوں کے لئے مخصوص ہوں گے۔ اس کشتی کی ساخت، کاریگری، اور نفاست سے اعلیٰ تہذیب کا اظہار ہوتا تھا۔

تحقیقاتی رپورٹ کی روانگی کے چند روز بعد روس میں انقلاب برپا ہوگیا اور زار کو معزول کر کے بالشویک گروہ نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ وتسکی جو سفید نسل روسی تھا، فرار ہو کر امریکہ چلا آیا، اور وہاں اس کی کہانی بے شمار اخبارات و رسائل میں شائع ہوئی۔ اس کی کشتیٔ نوح دریافت کرنے کی کہانی ریڈیو آسٹریلیا سے ۶ دسمبر ۱۹۴۲ء اور پھر دوبارہ ۲۰ جنوری ۱۹۴۶ء کو نشر کی گئی۔ ایک روایت کے مطابق دوسری جنگِ عظیم کے دوران انگلستان کے ایک

بقیہ صفحہ ۷۶ پر

فتاویٰ عالمگیری

از قلم : منظور احمد صاحب، لیکچرر، جامعہ زرعیہ، فیصل آباد

اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے عہدِ حکومت کے ابتدائی دور ہی میں روزمرّہ زندگی کے مسائل کو شریعتِ اسلامی کی روشنی میں حل کرنے کے لئے فقہ اسلامی پر ایک جامع اور مستند کتاب تدوین کرائی جو ہندوستان میں فتاویٰ عالمگیری کے نام کے ساتھ مشہور ہوئی۔ اس عظیم فتاویٰ کی تدوین کا کام اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی کے چار سال بعد ایک شاہی فرمان کے ذریعہ شروع ہوا اور آٹھ سال میں یعنی ۱۰۸۱ھ مطابق ۱۶۷۰ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ کتاب ہدایہ کے بعد فقہائے حنفیہ کے نزدیک مستند، معتبر اور جامع کتاب ہے۔ جو نہایت احتیاط سے ترتیب دی گئی۔ یہ کتاب مشرقِ وسطیٰ میں فتاویٰ ہندی کے نام سے مشہور ہے۔ فتاویٰ کا اصل نسخہ عربی میں ہے جو چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ قاہرہ ایڈیشن میں ۳۰۰۰ صفحات اور ایک لاکھ سطریں پائی جاتی ہیں۔ کتاب کی ابتدا فقہ اسلامی کے تفصیلی دیباچے سے ہوتی ہے جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

سیاسی پس منظر | فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کسی وقتی مصلحت یا محض ایک شخص کی خواہش کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس کا باعث مسلمانوں کا یہ شدید جذبہ تھا کہ اُن کے اجتماعی مسائل و مشاکل کا فیصلہ کتاب و سُنّت کی روشنی میں ہو۔ ایسی کتاب کی ضرورت عرصۂ دراز سے محسوس کی جارہی تھی جو انفرادی فتاویٰ کے اختلاف کو دور کرسکے اور قانون کی بنیادی کتاب کی حیثیت سے استعمال کی جاسکے لیکن محض سیاسی وجوہات کی وجہ سے ایسی کتاب مُدوّن نہ کی جاسکی۔ اس موقع پر اورنگ زیبؒ کے دَور اور اس سے پہلے کے حالات کا مختصر تذکرہ نہایت ضروری ہے۔ تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ وہ کون سے سیاسی محرّکات اور تغیّرات تھے جو اس جامع کتاب کی ترتیب کا سبب بنے۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت کی ابتداء صحیح معنوں میں خاندانِ غلاماں سے ہوتی ہے جو ایک مستحکم اور پائیدار حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس دَور میں مسلمانوں میں سیاسی اور فکری اتحاد تھا۔ حکومت کے قیام اور استحکام کے لئے ضروری تھا کہ باہمی اختلاف نہ ہوں۔ دوسری

جانب ہندو مسلمانوں کی کامیابی سے پریشان اور خوفزدہ تھے۔ ہندوؤں نے مسلمان حکمرانوں کے ساتھ تعاون اور میل ملاپ کی راہ اختیار نہیں کی بلکہ اُنہیں ناکام کرنے کے لئے اُن کا سوشل بائیکاٹ کیا۔ تاکہ وہ اپنی قومی خصوصیات کو برقرار رکھ سکیں اور اسلامی حکومت کو ختم کرنے کے لئے قوّت استعمال کی جائے۔ اس پالیسی پر وہ صدیوں عمل کرتے رہے اور آخر کار بابر کے مقابلے میں رانا سنگرام سنگھ راجپوتانے نے تمام راجاؤں کا محاذ بنا کر بابر کو نکالنے کی کوشش کی رانا اپنی شجاعت اور جوانمردی کے لئے بہت مشہور تھا لیکن بابر کے مقابلے میں اُن کی ناکامی نے ان کی آئندہ توقّعات پر بھی پانی پھیر دیا۔ اب انہوں نے اپنی بنیادی پالیسی میں تبدیلی کی۔ اور دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے جنگ و جدل کی راہ ترک کر کے راجپوتوں کے ایک بڑے گروہ نے مسلمان حکمرانوں سے تعاون کیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ راجپوت راجاؤں کی شہنشاہِ اکبر کے ساتھ بیاہ شادی کے تعلّقات کی ابتداء کسی وقتی جذبے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ایک گہری اور سوچی سمجھی سکیم کا پیش خیمہ تھا۔ ان بیاہ شادی کے تعلّقات ان کی پوزیشنیں مختلف ہوگئیں۔ اب انہوں نے کھُلّم کھُلاّ مخالفت اور میدانِ جنگ میں لڑکر مقاصد حاصل کرنے کی بجائے حکومت میں شریک ہو کر اور برسر اقتدار طبقے سے اپنے رشتے استوار کر کے حکومت کی مشینری کو زیادہ سے زیادہ اپنے مفاد میں ہموار کرنے کی کوششیں شروع کیں۔

ہندو راجاؤں کے ساتھ اکبرِ اعظم کا یہ اشتراک ہندوستان میں مسلمانوں کے حق میں بڑا نقصان دہ ثابت ہوا۔ مشہور مؤرّخ مُلّا بدایونی کو اکبر کی ان حرکتوں سے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ اپنے سارے احترام اور جاہ و حشم کو خطرے میں ڈال کر اکبر کی مخالفت پر تل گیا۔ اکبر اعظم کو یہ خبط بھی سوار ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق ختم کر دے۔ چنانچہ دینِ الٰہی کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ متعدّد ایسے احکامات اور اقدامات کئے جن سے اسلام کی بنیادی تعلیمات بھی مجروح ہوئیں۔ مسلمانوں میں اکبر کے اس رویّہ سے شدید اضطراب پیدا ہوا۔ علماء نے اس کے خلاف فتوے دیئے اور رؤسا نے بغاوتیں کیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اکبر کا اقتدار ڈگمگانے لگا۔ لیکن اکبر کے نئے وفادار اس کی پشت پر تھے۔ ان کی مدد سے وہ وقتی طور پر ان سنگین حالات سے عہدہ برآ ہو گیا۔ اکبر کی ان پالیسیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں مشرکانہ رسومات و عقائد سرایت کر گئے۔ بدعات اور کفر کو تقویّت پہنچی۔ ٹھیک اکبر کے آخری ایّام میں مجدّد الفِ ثانی نے اپنی تحریک احیاء اسلام

شروع کی مسلمانوں میں اسلامی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ آپ کی مخالفت ہوئی اور جہانگیر نے اپنی 'تزکِ جہانگیری' میں آپ کا تذکرہ ہتک آمیز الفاظ میں کیا ہے۔ لیکن آپ کی تحریک روز بروز پھیلتی گئی۔ بادشاہ کو مسلمانوں کی خواہش کے سامنے جھکنا پڑا اور جہانگیر کو جس نے مشرکانہ ماحول میں تربیت پائی تھی، اپنے باپ کی پالیسی ترک کرنی پڑی اور مجبوراً چند ایک ایسی اصلاحات کا اعلان کرنا پڑا جو کفر و شرک کی قوت توڑنے والی تھیں۔ ان ابتدائی دور میں تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تختِ دہلی کے امیدواروں میں ایک امیدوار کم از کم ایسا ضرور ہوتا جسے عام آزاد خیال مسلمانوں اور ہندوؤں کا تعاون حاصل ہوتا۔ دوسرا ایسا ہوتا جسے حساس اور باشعور مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہوتا تھا۔ گویا تخت دو مختلف ذہنوں والے امیدواروں کی آماجگاہ بنا رہتا اور دونوں میں قوت آزمائی ہوتی رہتی۔ اس قوت آزمائی میں بالآخر وہ کامیاب ہو جاتا جسے مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہوتی۔

چنانچہ شاہ جہاں کی کامیابی سے اور اس کے مختلف اقدامات سے ہندوؤں کو بہت نقصان پہنچا۔ شاہ موصوف اپنے پیش روؤں سے زیادہ دین کی طرف مائل تھا۔ اس نے نئے مندروں کی تعمیر کروائی اور جن ہندو اُمراء کے قبضے میں مسلمان عورتیں تھیں، حکم دیا کہ یا تو وہ مسلمان ہو جائیں یا ان مسلم خواتین کو آزاد کر دیں۔ جن مقامات پر باجماعت نماز کا انتظام نہیں تھا، اس کا انتظام کرایا۔ اس طرح شاہجہان کے دورِ حکومت میں مسلمانوں کی قوت جمع ہونا شروع ہو گئی۔ لیکن شاہجہاں کے عہد کے آخر میں شہزادہ دارا کی موجودگی جو اپنی ہندوانہ دلچسپیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا، آئندہ کے لئے خطرہ بن گئی۔ اورنگ زیب کے دارا کے ساتھ اختلافات کی وجہ یہی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو عالمگیر کی دیانت اور صلاحیت پر اعتماد تھا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی ہندوستان میں احیائے اسلام کا نیا دور شروع ہوا۔ شاہی ٹھاٹھ باٹھ کی جگہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سادہ زندگی اختیار کی گئی۔ لوگوں کی اخلاقی حالت بہتر بنانے کے لئے محکمۂ احتساب قائم کیا گیا، جس کا مقصد لوگوں کی اخلاقی حالت کی نگرانی اور انہیں غلط اور غیر شرعی عقائد سے باز رکھنا تھا۔ چنانچہ ان حالات کی تصدیق 'مآثرِ عالمگیری' کے مصنف کے بیان سے بھی ہوتی ہے: "بادشاہ رعیت نواز نے کبھی ایسا حکم صادر نہیں کیا جو رفاہِ عامہ کے خلاف ہو اور کبھی ایسے فعل کا مرتکب نہیں ہوا جو مخلوقِ خدا کی پریشانی کا باعث ہو۔ تمام ممالکِ محروسہ میں احکام شرعیہ نافذ کئے گئے!" — عالمگیر کی کامیابی اور اصلاحات کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین کا آوازہ بلند اور

حیات عام کے لئے مناسب فقہ پیدا ہوگئی اور معاملات انسانی کو شریعتِ اسلامی کی روشنی میں طے کرنے کے لئے فتاویٰ کی ضرورت محسوس ہوئی۔

فتاویٰ کی تدوین | عالمگیر کی اصلاحات سے حکومت کے ڈھانچہ میں اسلامی تصوّرات کو بہت کچھ دخل ہو چکا تھا۔ لیکن حکومت کی اصلاحات کے لئے بنیادی چیز عدلیہ کے قوانین ہوتے ہیں کیونکہ یہی شعبہ روزمرّہ زندگی کے معاملات کو کنٹرول کرتا ہے۔ شہنشاہ عالمگیر کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی رعایا کو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرے۔ چنانچہ آپ نے ایسی اصلاحات کیں جن سے روزمرّہ زندگی اسلامی ضابطہ کی گرفت میں آگئی۔ آپ سے پہلے فقہ کا کوئی جامع، مستند مجموعہ موجود نہیں تھا، جس میں تمام فقہائے اسلام کے فیصلے اور آراء محفوظ ہوں۔ جو کچھ تھا وہ منتشر اور پراگندہ صورت میں تھا۔ جس سے لوگوں کے لئے فائدہ حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ ساتھ ہی قاضیوں کو کافی دقّت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے کہ فقہ کا تمام ذخیرہ منتشر تھا۔ اگرچہ یہ دشواری پہلے بھی موجود تھی لیکن جدید اصلاحات اور اسلامی ماحول کی صورت میں اس دشواری کا احساس زیادہ ہونے لگا۔ چنانچہ عالمگیرؒ نے فقہ کی تدوین کے لئے علماء اور فقہاء کی کمیٹی کے قیام کی شدید ضرورت محسوس کی جو فقہ کی جامع کتاب مرتّب کرے تاکہ مسلمانوں کی زندگی کے مسائل فقہ اسلامی کی روشنی میں طے کئے جا سکیں۔ "مآثرِ عالمگیری" کا مصنّف بیان کرتا ہے: "بادشاہ نے ہندوستان کے مشاہیر علماء کے ایک گروہ کو حکم دیا کہ تمام فقہ کی کتابوں سے مفتیٰ بہا مسائل کا انتخاب کر کے ایک کتاب تیار کریں اور اس گروہ کے صدر شیخ نظام الدّین تھے۔ اس کارِ خیر کو سرانجام دینے کے لئے علماء کے وظائف اور دیگر اخراجات کی منظوری دی گئی۔" چنانچہ مشاہیر علماء اور فقہاء کا ایک بورڈ مقرّر کیا گیا اور حکم صادر کیا گیا کہ نہایت غور و فکر کے ساتھ تمام مستند کتابوں کا جو اس وقت پائی جاتی ہیں، مطالعہ کیا جائے اور یہ کتابیں سالہا سال کی کوششوں کے بعد شاہی کتب خانہ میں جمع کی گئی تھیں۔ یہ کام شیخ نظام الدّین کے سپرد تھا اور ان کا ایک کام یہ بھی تھا کہ علماء کی ایک اسمبلی بلائی جائے جن کی متفقہ آراء کے بعد ہی فیصلوں کو اصل کتاب میں نقل کیا جاتا تھا۔ اس غرض سے جیّد علماء کو ملک کے کونے کونے سے اکٹھا کیا گیا۔ انہیں سرکاری خزانے سے گراں قدر وظائف دیئے گئے۔ تاکہ دلجمعی کے ساتھ یہ اہم کام سرانجام دے سکیں۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق اس تمام جدّ و جُہد پہ کوئی ۳۰۔ لاکھ روپے خرچ آئے اور یہ عظیم فتاویٰ

آٹھ سال کی مدت میں مدوّن ہوا۔ 'مرآۃ العالم' کے مصنف نے ایسے ہی واقعات کا تذکرہ کیا ہے: "بادشاہ کی دلی خواہش تھی کہ تمام مسلمان شریعت کی تعلیمات اور اصول کو جیسا کہ فقہ حنفی کے مستند علماء اور مفتیوں نے سمجھا اور پیش کیا ہے، عام لوگ بھی سمجھیں اور اُن پر عمل کریں۔ لیکن شریعت کے یہ احکام اور ضابطے قاضیوں اور مفتیوں کے مختلف الخیال فیصلوں کی وجہ سے بہت پیچیدہ ہو گئے تھے۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ مشاہیر علماء کا ایک گروہ فقہ کی ضخیم اور مستند کتابوں کا جو شاہی کتب خانہ میں موجود ہیں، جائزہ لے کر ایک جامع کتاب تیار کرے تاکہ شریعت کا منشاء مستند ذرائع سے متعین ہو سکے۔ یہ کام نظام الدین برہان پوری کے سپرد کیا گیا جو علومِ عقلیہ اور نقلیہ میں مہارتِ تامّہ رکھتے تھے۔ اُن کی مدد کے لئے ممتاز علماء اور مشاہیر فقہاء کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا جن کے اخراجات کا حکومت کی جانب سے انتظام تھا۔

فتاویٰ کی ترتیب و تدوین 'فتاویٰ عالمگیری' جو اورنگ زیب کی دلچسپی اور علماء و فقہاء کی ایک تعداد کی شبانہ روز کوششوں سے آٹھ سال میں مرتب ہوا، یہ فقہ حنفی کی ایک عظیم اور بلند پایہ تصنیف ہے۔ اس میں ممتاز علماء اور فقیہوں کے فیصلے آراء، مختلف دقیق مسائل کی شرح، تنقیدیں، مذہبی قوانین، قواعد و ضوابط اور ایسے رسم و رواج جو زندگی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ان کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے شخصی قوانین جن کا تعلق وراثت، وصیت اور طلاق وغیرہ سے ہے، انہیں تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ اس طرح فتاویٰ کا دائرہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ فتاویٰ کی ابتداء میں ۳۰۰ صفحات پر مشتمل فقہ پر ایک عالمانہ اور محققانہ دیباچہ ہے، جو فقہ اور اُصولِ فقہ سے بحث کرتا ہے۔ جہاں تک فتاویٰ کی تدوین کا تعلق ہے، اس میں نہایت ہی احتیاط کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ کتاب کو مدوّن کرتے وقت مختلف حصّوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر حصّے کی تیاری کے لئے علماء کا ایک بورڈ متعین تھا جس میں دس سے بارہ تک جیّد علماء ہوتے تھے۔ اس کا ایک صدر یا انچارج ہوتا تھا جو پیش آمدہ مشکلات میں براہِ راست بادشاہ سلامت سے رجوع کرتا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ مباحث اور مضامین کے اعتبار سے فتاویٰ کئی حصّوں میں تقسیم تھا۔ چنانچہ ایک چوتھائی کام شیخ وجیہ الدین لاہوری کے سپرد ہوا۔ اس کی مدد کے لئے علماء کا ایک بورڈ مقرر تھا جو فقہ کی مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتے اور حوالے جمع کرتے۔ فتاویٰ کے دوسرے حصّے کی ترتیب کا کام شیخ جلال الدین جونپوری کے سپرد تھا۔

بقیہ ص ۶۷ پر

تبصرہ بر 'مہر منیر'

از قلم :- پروفیسر یوسف سلیم چشتی

پنجاب کے مشہور شیخ طریقت پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کے سوانح حیات "مہر منیر" کے نام سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئے تھے۔ پچھلے مہینے یہ کتاب میری نظر سے گذری۔۔
مَیں پیر صاحب کے علمی مقام سے تو عرصۂ دراز سے آگاہ تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اُن کی خدمت میں ایک عرضیہ لکھا تھا جس کے چند جملے یہ ہیں :

" اِس وقت ہندوستان بھر میں اور کوئی دروازہ نہیں ہے جو اس مقصد کے لئے کھٹکھٹایا جائے۔ چند اُمور دریافت طلب ہیں :
اوّل یہ کہ شیخ اکبرؒ نے حقیقتِ زمان کے متعلق کیا لکھا ہے اور (وہ) ائمۂ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے ؟
دوم یہ کہ حضرات صوفیہ میں سے اگر کسی اور بزرگ نے بھی حقیقتِ زمان پر بحث کی ہو تو ان کے ارشادات کے نشانات بھی مطلوب ہیں !"

لیکن یہ بات مجھے قطعاً معلوم نہیں تھی کہ پیر صاحبؒ موصوف علم عقائد میں بخلاف تمام چشتی صوفیائے پنجاب' اس قدر صحیح عقائد کے حامل ہیں۔ صوفیوں کو عموماً اور چشتیوں کو خصوصاً حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عقیدت اور ارادت میں جس قدر غُلو ہے وہ کوئی ڈھکی چھُپی بات نہیں ہے۔ اس کے ثبوت میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے صرف دو شعر پیش کرتا ہوں۔ جن کے متعلق اگر یہ نہ بتایا جائے کہ یہ اقبال کے اشعار ہیں تو پڑھنے والا یقیناً یہی یقین کرے گا کہ یہ کسی غالی شیعہ کے اشعار ہیں :

(۱) اے سرِ خطِ وجوب و امکاں ❖ تفسیرِ تو سورہ ہائے قرآں

یعنی تجھ میں وجوب (الوہیت) اور امکان (بشریّت) دونوں شانیں پائی جاتی ہیں بالفاظِ دگر' تو واجب الوجود بھی ہے اور ممکن الوجود بھی ہے یا خدا بھی ہے' انسان بھی ہے

ل؎ منقول از "صحیفہ" اقبال نمبر حصہ دوم ص۲۷

(نصاریٰ کا حضرت مسیح ابن مریم کے متعلق یہی عقیدہ ہے!) :[1]

(۲) اے سرِّ نبوّتِ محمّدؐ ؛ اے وصفِ تو مدحتِ محمّدؐ

یعنی اے علیؓ! آپ دراصل محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی نبوّت کا راز ہیں۔ اسی لئے اے علیؓ! آپ کی ثنا یا مدحت، محمّدؐ کی ثنا یا مدحت ہے۔ کیونکہ آپؓ دراصل عین محمّدؐ ہیں!

قارئین اقبال کے یہ شعر پڑھ کر پریشان نہ ہوں۔ اسلامی تصوّف جب تشیّع اور علی پرستی کا لباس زیبِ تن فرماتا ہے تو وہ سرّیت اور رمزیت اور باطنیت میں غرق ہو کر سراسر غیر اسلامی بن جاتا ہے۔ جس کا تعلق نہ قرآن سے باقی رہتا ہے نہ حدیثِ رسولؐ سے!

باز آمدم بر سرِ مطلب، پیر صاحبؒ چشتی ہونے کے باوجود سادگی عمر و اعتدال پر گامزن رہے۔ چونکہ پیر صاحبؒ کی کئی تصانیف میری نظر سے گذر چکی ہیں اس لئے میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس صدی میں (اب ۱۹۸۰ء ہے) پیر مہر علی شاہ سے بڑا منطقی اور فلسفی اور متکلّم صوفی میری نظر سے نہیں گذرا (میری عمر ۸۵ سال کے قریب ہے) اگر وہ سجّادہ نشینی کے بجائے معقولات کی تدریس کا شغل اختیار کر لیتے تو بلاشبہ اپنے وقت کے مولینا فضل حق خیرآبادی ہوتے۔

واضح ہو کہ منطقی ہونے کے لئے صرف درسی علم کافی نہیں ہے، اس کے لئے ذہین ہونا پہلی شرط ہے اور پیر مہر علی شاہ، ماں کے پیٹ سے ذہین پیدا ہوئے تھے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست ؛ تا نہ بخشند خدائے بخشندہ[2]

اس تمہید طولانی کے بعد (جس کے لئے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا!)

---

[1] سپاسِ جنابِ امیرؑ مندرجہ "مخزن" بابت ماہ جنوری ۱۹۰۵ء۔ یہ وہ نظم ہے جو اقبال مرحوم صبح کے وقت پڑھا کرتے تھے اور اس میں ۳۴۔ اشعار ہیں ؛ (کما فی الاصل)

[2] اُن کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ ایک عالمِ دین نے اُن سے کہا کہ میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ آپ جواب دیتے وقت، قرآن کے معانی میں تاویل سے کام نہ لیں۔۔ پیر صاحب نے جواب دیا کہ مجھے یہ شرط منظور ہے بشرطیکہ آپ بھی تاویل سے کام نہ لیں اور سوال کرنے سے پہلے مجھے اس آیت کے معنیٰ سمجھا دیں : "مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى!" یہ سُن کر وہ صاحب خاموش ہو گئے۔۔!!

ذیل میں چند شواہد پیش کرتا ہوں :

(۱) ص۲۴۴ : " واقعۂ فدک میں جنابہ سیدہ رضؓ کے سوال میراث پر آپ فرمایا کرتے تھے کہ اُن رضؓ کے سوال سے مسلمانوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا معاملہ واضح ہوگیا۔ اگر آپ یہ تحریک نہ فرماتیں تو صحابہؓ کے مجمع کے سامنے حضرت صدیق اکبرؓ یہ حدیث پیش نہ فرماتے کہ انبیاء علیہم السلام مال واسباب بطورِ وراثت نہیں چھوڑتے، اُن کی وراثت علم ہے۔ اس حدیث کی تصدیق تمام حاضرین صحابہ کرامؓ نے فرمائی جن میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ بھی شامل تھے۔!"

(۲) ص۵۹ : "حدیثِ قرطاس کے ضمن میں فرمایا کہ حضرت عمرؓ کو محلِ طعن بنانے والوں نے دو غلطیاں کی ہیں ایک تو اُن رضؓ کے کلام کا مطلب ایسے زہریلے رنگ میں ادا کیا ہے جو کوئی منافق بھی (اس وقت کے منافقین میں سے) نہیں کہہ سکتا تھا۔ دوسری یہ کہ : " اَھَجَرَ اِسْتَفْہِمُوْہُ" کا جملہ بھی مخالفین نے حضرت عمرؓ سے منسوب کیا ہے جو خلافِ واقعہ ہے۔ پھر فرمایا کہ : خطاب نبوی سب حاضرین سے تھا۔ صرف حضرت عمرؓ سے مخصوص نہیں تھا۔ جن میں سیدنا علیؓ اور سیدنا عباسؓ بھی شامل تھے۔ پس اگر مطعون ٹھیریں گے تو سب، نہ صرف حضرت عمرؓ (اگر حضرت عمرؓ نے تعمیل حکم نہیں کی تو حضرت علیؓ کو کس نے روک دیا تھا) بلکہ سب سے زیادہ سیدنا علیؓ پر مطاعن کا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ خطابات اسد اللہ اور خیبر شکن سے ملقب تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کسی سے ڈر کر ارشاد نبوی کی تعمیل سے گریز کیا ہو۔ اگر بفرضِ محال ایسا ہی تھا تو بھی کامل تین دن میں حضرت عمرؓ سے علیحدگی کے وقت انہیں تعمیلِ حکم کا موقع مل سکتا تھا۔ حاضرین میں سے کسی کا بھی تعمیل نہ کرنا صاف بتا رہا ہے کہ کتابت زیر بحث ضروری نہیں تھی ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو بالاتفاق معصوم ہیں، کسی کے روکنے سے کب رک سکتے تھے!" (ص۵۶)

(۳) "خم غدیر والی حدیث کو خلافت بلا فصل سیدنا علیؓ سے کوئی تعلق نہیں ہے، ورنہ در ایامِ مرضِ وفات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بارشادِ مکرر، حضرت صدیق اکبرؓ کو تین دن کی نمازوں کے لئے امام نہ بناتے۔ اسی پر حضرتِ علیؓ نے فرمایا تھا: قَدَّمَکَ رسولُ اللہِ فَمَن ذا الَّذی یُؤَخِّرُکَ ؟۔ یعنی آپ کو رسولؐ اللہ نے پیش امام مقرر

فرمایا ہے تو کون ہے جو آپؐ کو تبلیغ کرے ؟"

(۴) "سیدۃ النساء رضی کی نسبت ہبہ یا وصیت کا دعویٰ بھی محض اُن پر افترا اور بہتان ہے۔ اگر مطالبہ بطورِ ارث تھا تو ہبہ نہیں ہو سکتا اور نہ بالعکس۔ اسی طرح دعویٰ میراث اور دعویٰ وصیت میں تناقض ہے!" (ص۵۶۱)

(۵) "حدیثِ ثقلین کے بارے میں حضرت (پیر صاحب) فرماتے ہیں کہ طعن کرنے والوں (شیعوں) کا یہ دعویٰ کہ اہلِ سنت نے کبھی اس حدیث پر عمل نہیں کیا، صحیح نہیں ہے۔ بلکہ معاملہ برعکس ہے کیونکہ اہلِ سنت نے تو اسی قرآن کو جو ان کے پاس ہے اور غیر محرّف ہے، اپنا دستور العمل بنایا ہوا ہے۔ بخلاف ایں طاعنین (شیعوں) کا عقیدہ یہ ہے کہ ثقلِ اکبر یعنی قرآن کو جنابِ امیر رضی نے غائب کر دیا تھا اور تیسری صدی سے امام غائب کے پاس غارِ سُرّ من رّاٰی میں بتایا جاتا ہے۔ پس ان حضرات کو تو آج تک تمسک بالقرآن نصیب نہیں ہوا۔" (ص۵۶۳)

(۶) ترمذی کی حدیث: "اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا!"۔ پہ شیخ ابن تیمیہ رح نے "منہاج السنّۃ" میں اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ واقعات کی رُو سے بھی نفسِ مضمون صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ علمِ نبوّت کا صرف ایک دروازہ حضرت علی رضی ہوں ؟ جن سے صرف کوفیوں نے قلیل مدت کے لئے علم حاصل کیا ہو اور باقی بلادِ اسلامیہ میں علم اوروں سے پہنچا ہ؟" (ص۵۶۳)

(۷) "حدیث: "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ!" کی تشریح میں ایک بار حضرت رح نے فرمایا تھا کہ لفظ مولیٰ مشترک ہے، کئی معنیٰ رکھتا ہے۔ مشترک کے معنیٰ کے تعیّن کے لئے قرینے کا لحاظ لازمی ہے۔ اس لئے یہاں مَولیٰ کے معنی محبوب یا دوست کے، لئے جائیں گے۔ یعنی علی رضی سب مومنوں کے محبوب یا دوست ہیں۔ لیکن ہمارے برادرانِ طریقت مَولیٰ کے وہ معنی لیتے ہیں جو پنجابی زبان میں مفہوم ہیں یعنی سردار، بالفاظِ دگر تمام اصحاب کے سردار۔ لیکن یہ معنی محض خوش فہمی (غلط فہمی) پر مبنی ہیں!" (ص۵۶۵)

اضافہ از سوانح نگار "اس میں تو شک نہیں کہ حضرت رح کو حضرت علی رضی سے بے حد محبت تھی جو درجۂ انہماک تک پہنچی ہوئی تھی مگر آپؒ کا کمال یہ تھا کہ غلبۂ عشق و محبت

بقیہ ص۶۷ پر

ترتیب و انتخاب
محمد یونس ایم۔اے،

قسط سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن اور آثارِ کائنات

نظامِ کائنات

سات آسمانوں کی حقیقت

ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (البقرۃ۔ ۲۹)

"پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان اُستوار کئے"۔

سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے، اس کا تعین مشکل ہے۔ انسان ہر زمانے میں آسمان یا بالفاظِ دیگر ماورائے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے، جو برابر بدلتے رہے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی تصور کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بس مجملاً اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماوراء جس قدر کائنات ہے اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقہ میں واقع ہے وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔

(سورہ البقرہ۔ حاشیہ ۳۴، تفہیم القرآن جلد اوّل)

آسمانی بُرج۔ اللہ کی کارفرمائی، حکمت، آرٹ

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝

(الحجر۔ ۱۶)

"یہ ہماری کارفرمائی ہے کہ آسمان میں ہم نے بہت سے مضبوط قلعے بنائے اور اُن کو دیکھنے والوں کے لئے مزین کیا"۔

بُرج عربی زبان میں قلعے، قصر اور مستحکم عمارت کو کہتے ہیں۔ قدیم علمِ ہیئت میں 'بُرج' کا لفظ اصطلاحاً اُن بارہ منزلوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، جن پر سورج کے مدار کو تقسیم کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے بعض مفسّرین نے یہ سمجھا کہ قرآن کا اشارہ انہی بروج کی طرف ہے۔ بعض دوسرے مفسّرین نے اس سے مراد سیّارے لئے ہیں۔ لیکن بعد کے مضمون پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے مراد عالمِ بالا کے وہ خطّے ہیں، جن میں سے ہر خطّے کو نہایت مستحکم سرحدوں نے دوسرے خطّے سے جدا کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہ سرحدیں فضائے بسیط میں غیر مرئی طور پر کھچی ہوئی ہیں، لیکن ان کو پار کر کے کسی چیز کا ایک خطّے سے دوسرے خطّے میں چلا جانا سخت مشکل ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے ہم بُروج کو محفوظ خطّوں (FORTIFIED SPHERES) زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔ ہر خطّے میں کوئی نہ کوئی روشن سیّارہ یا تارا رکھ دیا اور اس طرح سارا عالم جگمگا اٹھا۔ بالفاظِ دیگر ہم نے اس ناپیدا کنار کائنات کو ایک بھیانک ڈھنڈار بنا کر نہیں رکھ دیا بلکہ ایک ایسی حسین و جمیل دُنیا بنائی جس میں ہر طرف نگاہوں کو جذب کر لینے والے جلوے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کاریگری میں صرف ایک صانعِ اکبر کی صنعت اور ایک حکیم اجل کی حکمت ہی نظر نہیں آتی بلکہ ایک کمال درجے کا پاکیزہ ذوق رکھنے والے آرٹسٹ کا آرٹ بھی نمایاں ہے۔ (سورہ۔ الحجر، حاشیہ۔ ۸)

شہابِ ثاقب اور محفوظ خطّے

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ۝

(الحجر۔ ۱۸)

"اِلّا یہ کہ کچھ سُن گُن لے لے، اور جب وہ سُن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلہ روشن اُس کا پیچھا کرتا ہے۔"

'شہابِ مُبین' کے لُغوی معنی 'شعلۂ روشن' کے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن میں اس کے لئے 'شہابِ ثاقب' کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی 'تاریکی کو چھیدنے والا شعلہ'۔ اس سے مراد ضروری نہیں کہ وہ ٹوٹنے والا تارا ہی ہو۔ جیسے ہماری زبان میں اصطلاحاً شہابِ ثاقب کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اور کسی قسم کی شعاعیں (COSMIC RAYS) یا ان

سے بھی زیادہ شدید کوئی اور قسم جو ابھی ہمارے علم میں نہ آئی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی شہابِ ثاقب مراد ہوں جنھیں کبھی کبھی ہماری آنکھیں زمین کی طرف گرتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ زمانۂ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دُوربین سے دکھائی دینے والے شہابِ ثاقب جو فضائے بسیط سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، ان کی تعداد کا اوسط ۱۰ - کھرب روزانہ ہے۔ جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں، اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے۔ اُن کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سیکنڈ ہوتی ہے، اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سیکنڈ تک دیکھی گئی ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے۔ چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ر نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکہ کے مشرقی علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر صبح تک دو لاکھ شہابِ ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا - ۱۹۴۶ء جلد ۱۵ ص ۳۹-۳۳۷)۔ ہو سکتا ہے کہ یہی بارش عالمِ بالا کی طرف شیاطین کی پرواز میں مانع ہوتی ہے۔ کیونکہ زمین کے بالائی حدود سے گذر کر فضائے بسیط میں ۱۰ - کھرب روزانہ کے اوسط سے ٹوٹنے والے تاروں کی برسات اُن کے لئے اس فضا کو بالکل ناقابلِ عبور بنا دیتی ہوگی۔

اس سے کچھ ان 'محفوظ قلعوں' کی نوعیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے، جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بظاہر فضا بالکل صاف شفّاف ہے، جس میں کہیں کوئی دیوار یا چھت نہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی فضا میں مختلف خطّوں کو کچھ ایسی غیر مرئی فصیلوں سے گھیر رکھا ہے جو ایک خطّے کو دوسرے خطّوں کی آفات سے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ انہی فصیلوں کی برکت ہے کہ جو شہابِ ثاقب دس کھرب روزانہ کے اوسط سے زمین کی طرف گرتے ہیں، وہ سب جل کر بھسم ہو جاتے ہیں اور بمشکل ایک آدھ زمین کی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔ دنیا میں شہابی پتھروں (METEORITES) کے جو نمونے پائے جاتے ہیں اور دُنیا کے عجائب خانوں میں موجود ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ۶۴۵ پونڈ کا ایک پتھر جو گر کر ۱۱ فٹ زمین میں دھنس گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مقام پر ۳۶ ½ ٹن کا ایک آہنی تودہ پایا گیا ہے جس کے وہاں موجود ہونے کی کوئی توجیہ سائنس دان اس کے سوا نہیں کر سکے ہیں کہ یہ بھی آسمان سے گرا ہوا ہے۔ قیاس کیجئے کہ اگر زمین کی بالائی سرحدوں کو مضبوط حصاروں سے

محفوظ نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان ٹوٹنے والے تاروں کی بارش زمین کا کیا حال کر دیتی۔ یہی حصار ہیں جن کو قرآن مجید نے 'بُروج' (محفوظ قلعوں) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

(سورۃ البروج۔ حاشیہ ۱۲ تفہیم القرآن جلد دوم)

رہا یہ سوال کہ ان شہابوں کی حقیقت کیا ہے، تو اس کے بارے میں انسان کی معلومات اس وقت تک کسی قطعی تحقیق سے قاصر ہیں۔ تاہم جس قدر بھی حقائق اور واقعات جدید ترین دور تک انسان کے علم میں آئے ہیں، اور زمین پر گرے ہوئے شہابیوں کے معائنے سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں، ان کی بنا پر سائنسدانوں میں سب سے زیادہ مقبول نظریہ یہی ہے کہ یہ شہابے کسی سیارے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلا میں گھومتے رہتے ہیں۔ اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آکر ادھر کا رخ کر لیتے ہیں۔

(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ایڈیشن ۱۹۶۷۔ جلد ۱۵۔ لفظ METEORITES)
سورہ الملک۔ حاشیہ ۱۱، تفہیم القرآن جلد ششم)

کائنات کی ابتدائی شکل

اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ

(الانبیاء - ۳۰)

"یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جُدا کیا!"

اصل میں لفظ 'رتق' اور 'فتق' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ 'رتق' کے معنی یکجا ہونا، اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، متصل اور متلاصق ہونا اور 'فتق' کے معنی پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں۔ بظاہر ان الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک تودے (MASS) کی سی تھی۔ بعد میں اس کو الگ الگ حصّوں میں تقسیم کر کے زمین اور دوسرے اجرامِ فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے۔ سورہ حٰمٓ السجدہ، آیت ۱۱ میں فرمایا:

"پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اُس وقت محض دھواں تھا!"

(سورۃ الانبیاء - حاشیہ - ۲۸، تفہیم القرآن جلد سوم)

دھوئیں سے مراد مادّے کی وہ ابتدائی حالت ہے جس میں وہ کائنات کی صورت گری

سے پہلے ایک بے شکل منتشر الاجزاء غبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ زمانے کے سائنسدان اس چیز کو سحابیے (NEBULAE) سے تعبیر کرتے ہیں، اور آغاز کائنات کے متعلق ان کا تصور بھی یہی ہے کہ تخلیق سے پہلے وہ مادہ جس سے کائنات بنی ہے اس دخانی یا سحابی شکل میں منتشر تھا (سورہ حٰم السجدہ - حاشیہ - ۱۴ ۔ تفہیم القرآن جلد چہارم)

نظام شمسی

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ط (یٰسٓ-۳۸)

"اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے!"

ٹھکانے سے مراد وہ جگہ بھی ہو سکتی ہے، جہاں جا کر سورج کو آخر کار ٹھہر جانا ہے اور وہ وقت بھی ہو سکتا ہے جب وہ ٹھیر جائے گا۔ اس آیت کا صحیح مفہوم انسان اس وقت متعین کر سکتا ہے، جبکہ اسے کائنات کے حقائق کا ٹھیک ٹھیک علم حاصل ہو جائے۔ لیکن انسانی علم کا حال یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ میں بدلتا رہا ہے اور آج جو کچھ اسے بظاہر معلوم ہے اس کے بدل جانے کا ہر وقت امکان ہے۔ سورج کے متعلق قدیم زمانے کے لوگ عینی مشاہدے کی بنا پہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ پھر مزید تحقیق و مشاہدہ کے بعد یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ وہ اپنی جگہ ساکن ہے، اور نظام شمس کے سیارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ بھی مستقل ثابت نہ ہوا۔ بعد کے مشاہدات سے پتہ چلا کہ نہ صرف سورج بلکہ وہ تمام تارے جن کو ثوابت (FIXED-STARS) کہا جاتا ہے، ایک رخ پر چلے جا رہے ہیں۔ ثوابت کی رفتار کا اندازہ ۱۰ سے لے کر ۱۰۰ میل فی سیکنڈ تک کیا گیا ہے۔ اور سورج کے متعلق موجودہ زمانہ کے ماہرین فلکیات کہتے ہیں کہ وہ اپنے پورے نظام شمس کو لئے ہوئے ۲۰۔ کلومیٹر (تقریباً ۱۲ میل) فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا لفظ سٹار اور لفظ سَن) (سورۂ یٰسٓ۔ حاشیہ ۳۳، تفہیم القرآن جلد چہارم)

آسمانِ دُنیا - ہر تارے اور سیارے کا محفوظ کرہ

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ ِالْكَوَاكِب ۝ (الصّٰفّٰت-۶)

"ہم نے آسمانِ دُنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے!"

آسمانِ دُنیا سے مراد قریب کا آسمان ہے، جس کا مشاہدہ کسی دوربین کی مدد کے بغیر ہم برہنہ آنکھ سے کرتے ہیں۔ اس کے آگے جو عالم مختلف طاقتوں کی دُوربینوں سے نظر آتے ہیں، اور جن عالموں تک ابھی ہمارے وسائلِ مشاہدہ کی رسائی نہیں ہوئی ہے وہ سب دُور کے آسمان ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ "سَمَاء" کسی متعیّن چیز کا نام نہیں ہے بلکہ قدیم ترین زمانے سے آج تک انسان بالعموم یہ لفظ اور اس کے ہم معنیٰ الفاظ عالمِ بالا کے لئے استعمال کرتا چلا آرہا ہے۔

(سورۃ الصّٰفّٰت۔ حاشیہ۔ ۵۰ تفہیم القرآن جلد چہارم)

عالمِ بالا محض خلا ہی نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے، بلکہ اس کی بندش ایسی مضبوط ہے اور اس کے مختلف خطّے ایسی مستحکم سرحدوں سے محصور کئے گئے ہیں کہ کسی شیطانِ سرکش کا ان حدوں سے گذر جانا ممکن نہیں ہے۔ کائنات کے ہر تارے اور سیّارے کا اپنا ایک دائرہ اور کُرہ (SPHERE) ہے۔ جس کے اندر سے کسی کا نکلنا بھی سخت دشوار ہے، اور جس میں باہر سے کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ ظاہری آنکھ سے کوئی دیکھے تو خلائے محض کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔ لیکن حقیقت میں اس خلا کے اندر بے حد و حساب خطّے ایسی مضبوط سرحدوں سے محفوظ کئے گئے ہیں، جن کے مقابلے میں آہنی دیواروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان گوناگوں مشکلات سے کیا جا سکتا ہے، جو زمین کے رہنے والے انسان کو اپنے قریب ترین ہمسائے چاند تک پہنچنے میں پیش آرہی ہیں۔ ایسی ہی مشکلات زمین کی دوسری مخلوق یعنی جنّوں کے لئے بھی عالمِ بالا کی طرف صعود کرنے میں مانع ہیں۔

(سورۃ الصّٰفّٰت حاشیہ ۶ تفہیم القرآن جلد چہارم)

زمین فضا میں معلّق ایک کُرہ۔ گہوارہ

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا۔ (الزخرف۔۱۰)

"وہی تھا جس نے تمھارے لئے اس زمین کو گہوارہ بنایا!"

دوسرے مقامات پر تو زمین کو فرش سے تعبیر کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے لئے گہوارہ کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ یعنی جس طرح ایک بچّہ اپنے پنگھوڑے میں

آرام سے لیٹا ہوتا ہے۔ اتنے ہی آرام کی جگہ تمھارے لئے اس عظیم الشان کرّے کو بنا دیا جو فضا میں معلق ہے۔ جو ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنے محور پر گھوم رہا ہے، جو ۶۶۶۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رواں دواں ہے۔ جس کے پیٹ میں وہ آگ بھری ہے کہ پتھروں کو پگھلا دیتی ہے، اور آتش فشانوں کی شکل میں لاوا اگل کر کبھی کبھی تمھیں بھی اپنی شان دکھا دیتی ہے۔ مگر اس کے باوجود تمھارے خالق نے اسے اتنا پُرسکون بنا دیا ہے کہ تم آرام سے اس پر سوتے ہو اور تمھیں جھٹکا تک نہیں لگتا۔ تم اس پر رہتے ہو اور تمھیں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ کُرہ معلق ہے اور تم اس پر سر کے بل لٹکے ہوئے ہو۔ تم اطمینان سے اس پر چلتے پھرتے ہو۔ اور تمھیں یہ خیال تک نہیں آتا کہ تم بندوق کی گولی سے بھی زیادہ تیز رفتار گاڑی پر سوار ہو، بے تکلف اسے کھودتے ہو، اس کا سینہ چیرتے ہو، طرح طرح سے اس کو پیٹ کر اپنا رزق اس سے وصول کرتے ہو۔ حالانکہ اس کی ایک معمولی سی جھرجھری کبھی زلزلے کی شکل میں آ کر تمھیں خبر دے دیتی ہے، کہ یہ کس بلا کا خوفناک دیو ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے تمھارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ (سورہ الزخرف۔ حاشیہ ۷ تفہیم القرآن جلد چہارم)

زمین کے متعلق ایک صاحب کے مکتوب کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"زمین کی حرکت اور سیاروں کی گردش اور آسمانوں کی ترکیب کے معاملے میں قرآن کے ارشادات کو سمجھنے کے لئے اس بنیادی بات کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے۔ کل اگر حرکتِ زمین کا ذکر کیا جاتا تو لوگوں کا دماغ چکرا جاتا۔ آج اگر بطلیموسی نظام کی بات کی جائے اور زمین کو ساکن قرار دے کر سورج اور دیگر سیاروں کو اس کے گرد گھمایا جائے تو اسکول کا ایک معمولی بچہ بھی مذاق اُڑانے پر آمادہ ہو جائے۔ قرآن مجید میں اس معاملہ کے متعلق کوئی صاف اور قطعی بات نہیں کہی گئی ہے۔ کیونکہ وہ طبیعیات و فلکیات وغیرہ علوم سکھانے نہیں آیا ہے۔ جس غرض کے لئے وہ ان آثارِ کائنات سے استدلال کر رہا ہے، اس کے لئے حرکت اور سکون دونوں صورتوں میں یکساں استدلال ممکن ہے۔ اب خواہ مخواہ ہم کیوں قرآن کے بیان کو کسی ایک چیز پر جمانے کی کوشش کریں جو کسی ایک دور کی معلومات یا مظنونات کے مطابق ہو اور دوسرے دور میں انسان کے قائم کردہ نظریات یا مشاہدات اس کو جھٹلا دیں۔ میں نے جس بنا پر یہ کہا ہے کہ قرآن کے بعض اشارات

زمین کے متحرک ہونے کی تائید کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ قرآن مجید افلاک کا تصور یہ پیش کرتا ہے کہ وہ سمندروں کی طرح ہیں، جن میں کوئی چیز تیر رہی ہے، اور افلاک کی بجائے وہ اجرامِ فلکی کو گردش کرتے ہوئے دکھاتا ہے۔ یعنی وہ افلاک کے اندر تیر رہے ہیں۔ اب اگر زمین بھی ایک جرمِ فلکی ہی ہے، تو لامحالہ یہ بھی ٹھیری ہوئی نہیں ہے، بلکہ تیر رہی ہے۔ قرآن اس کے ٹھہرے ہوئے ہونے کا جو ذکر کرتا ہے وہ ہماری نسبت سے ہے نہ کہ نظامِ افلاک کی نسبت سے۔

قطب تارے کے ساتھ زمین کی نسبت یکساں رہنے سے جو استدلال کسی مفسر نے کیا ہے، وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص دو ٹرینوں کو متوازی لائنوں پر ایک ساتھ ایک رفتار سے چلتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس کرے کہ دونوں کھڑی ہوئی ہیں اور اپنے اس احساس کو ان کے سکون پر دلیل کی حیثیت سے پیش کرے۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ آپ ایک ٹرین میں بیٹھے ہوں، اور آپ کی ٹرین چل پڑے۔ لیکن برابر کی لائن پر ایک ٹرین کھڑی ہو تو کافی دیر تک آپ کو یوں محسوس ہوتا رہے گا کہ حرکت میں دوسری ٹرین ہے نہ کہ آپ کی ٹرین۔ کیا اس طرح کے احساسات اُمورِ واقعیہ کیلئے کافی ہو سکتے ہیں؟ (مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی حصہ اوّل، مکتوب نمبر ۱۔

محکم اور مضبوط اجرامِ فلکی کی طرح مضبوط اور محکم کلام

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ (الواقعہ۔ ۷۵ تا ۷۷)

"پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے، کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے!"

تاروں اور سیاروں کے مواقع سے مراد ان کے مقامات، ان کی منزلیں اور ان کے مدار ہیں۔ اور قرآن کے بلند پایہ کتاب ہونے پر ان کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ بالا میں اجرامِ فلکی کا نظام جیسا محکم اور مضبوط ہے، ویسا ہی مضبوط اور محکم یہ کلام بھی ہے۔ جس خدا نے وہ نظام بنایا ہے، اُس خدا نے یہ کلام بھی نازل کیا ہے۔ کائنات کے بے شمار کہکشانوں (GALAXIES) اور ان کہکشانوں کے اندر

بے حد و حساب تاروں (STARS) اور سیاروں (PLANETS) میں جو کمال درجے کا ربط و نظم قائم ہے، درانحالیکہ بظاہر وہ بالکل بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح یہ کتاب بھی ایک کمال درجہ کا مربوط و منظم ضابطۂ حیات پیش کرتی ہے۔ جس میں عقائد کی بنیاد پر اخلاق عبادات، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، قانون و عدالت، صلح و جنگ غرض انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مفصل ہدایات دی گئی ہیں۔ اور ان میں کوئی چیز کسی دوسری سے بے جوڑ نہیں ہے، درانحالیکہ یہ نظام فکر متفرق آیات اور مختلف مواقع پر دیئے ہوئے خطبوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر جس طرح خدا کے باندھے ہوئے عالم بالا کا نظم اٹل ہے، جس میں کبھی ذرّہ برابر فرق واقع نہیں ہوتا، اسی طرح اس کتاب میں بھی حقائق بیان کئے گئے ہیں اور جو ہدایات دی گئی ہیں، وہ بھی اٹل ہیں، اُن کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا۔

(سورۃ الواقعہ۔ حاشیہ ۳۷۔ تفہیم القرآن جلد پنجم)

سورج، ہوا، معدنی اور کیمیاوی اجزاء، پانی، کششِ ثقل زمین اور سورج کا فاصلہ جیسی مناسبتیں۔ زندگی کیلئے لازمی ہیں

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا۔ (النمل - ۶۱)

"یا وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا!"

زمین کا اپنی بے حد و حساب مختلف النوع آبادی کے لئے جائے قرار ہونا بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ اس کُرۂ خاکی کو جن حکیمانہ مناسبتوں کے ساتھ قائم کیا گیا ہے، اُن کی تفصیلات پر آدمی غور کرے تو اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مناسبتیں ایک حکیم و دانا قادرِ مطلق کی تدبیر کے بغیر قائم نہ ہو سکتی تھیں۔ یہ کُرہ فضائے بسیط میں معلق ہے، کسی چیز پر ٹکا ہوا نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب اور اہتزاز نہیں ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی اہتزاز ہوتا، جس کے خطرناک نتائج کا ہم کبھی زلزلہ آجانے سے کسی حد تک اندازہ لگا سکتے ہیں، تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ تھی۔ یہ کُرہ باقاعدگی کے ساتھ سورج کے سامنے آتا اور چھپتا ہے۔ جس سے رات اور

دن کا اختلاف رُونما ہوتا ہے۔ اگر اس کا ایک ہی رُخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دوسرا رُخ ہر وقت چھپا رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی۔ کیونکہ ایک رخ کو سردی اور بے نوری نباتات اور حیوانات کی پیدائش کے قابل نہ رکھتی، اور دوسرے رُخ کو گرمی کی شدّت بے آب و گیاہ اور غیر آباد بنا دیتی۔ اس کُرہ پر پانچ سو میل کی بلندی تک ہوا کا ایک کثیف ردّہ چڑھا دیا گیا ہے۔ جو شہابوں کی خوفناک بمباری سے اسے بچائے ہوئے ہے۔ ورنہ روزانہ دو کروڑ شہاب جو ۳۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں، یہاں وہ تباہی مچاتے کہ کوئی انسان، حیوان یا درخت جیتا نہ رہ سکتا تھا۔ یہی ہوا درجۂ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے، یہی سمندروں سے بادل اٹھاتی اور زمین کے مختلف حصّوں تک آب رسانی کی خدمت انجام دیتی ہے، اور یہی انسان اور حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوبہ گیسیں فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تب بھی زمین کسی آبادی کے لئے جائے قرار نہ بن سکتی۔ اس کی سطح سے بالکل متصل وہ معدنیات اور مختلف قسم کے کیمیاوی اجزاء بڑے پیمانے پر فراہم کر دیئے گئے ہیں، جو نباتی، حیوانی اور انسانی زندگی کے لئے مطلوب ہیں۔ جس جگہ بھی یہ سروسامان مفقود ہوتا ہے وہاں کی زمین کی زندگی کو سہارنے کے لائق نہیں ہوتی۔ اس کرے پر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور زیرِ زمین سوتوں کی شکل میں پانی کا بڑا عظیم الشان کا ذخیرہ فراہم کر لیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں پر بھی اُس کے بڑے بڑے ذخائر کو منجمد کرنے اور پھر پگھلا کر بہنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس تدبیر کے بغیر یہاں کسی زندگی کا امکان نہ تھا۔ پھر اس پانی، ہوا اور تمام ان اشیاء کو جو زمین پر پائی جاتی ہیں، سمیٹے رکھنے کے لئے اس کرے میں نہایت ہی مناسب کشش رکھ دی گئی ہے۔ یہ کشش اگر کم ہوتی تو ہوا اور پانی دونوں کو نہ روک سکتی اور درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہوتا کہ زندگی یہاں دشوار ہو جاتی۔ یہ کشش اگر زیادہ ہوتی تو ہوا بہت کثیف ہو جاتی، اس کا دباؤ بہت بڑھ جاتا، بخاراتِ آبی کا اٹھنا مشکل ہوتا اور بارشیں نہ ہو سکتیں، سردی زیادہ ہوتی۔ زمین کے بہت کم رقبے آبادی کے قابل ہوتے۔ بلکہ کشش ثقل بہت زیادہ ہونے کی صورت میں انسان اور حیوانات کی جسامت بہت کم ہوتی، اور ان کا وزن اتنا زیادہ ہوتا کہ نقل و حرکت بھی ان کے لئے مشکل ہوتی۔ علاوہ بریں اس کُرے کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے، جو آبادی کے لئے مناسب ترین ہے۔ اگر اس کا فاصلہ زیادہ ہوتا تو

اس کے برعکس گرمی کی زیادتی اور دوسری بہت سی چیزیں مل جل کر اسے انسان جیسی مخلوق کی سکونت کے قابل نہ رہنے دیتیں۔

یہ صرف چند وہ مناسبتیں ہیں جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لئے جائے قرار بنی ہے۔ کوئی شخص عقل رکھتا ہو اور ان امور کو نگاہ میں رکھ کر سوچے تو وہ ایک لمحے کے لئے نہ یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ کسی خالق حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسبتیں محض ایک حادثے کے نتیجے میں خود بخود قائم ہو گئی ہیں، اور نہ ہی یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس عظیم الشّان تخلیقی منصوبے کو بنانے اور رُو بعمل لانے میں کسی دیوی، دیوتا، یا جِنّ یا نبی ولی کا کوئی دخل ہے۔ (سورہ النمل حاشیہ ۴۷، تفہیم القرآن جلد سوم)

قصّہ ہُدہُد اور حیوانی زندگی کا جدید مشاہدہ

قَالَ سَنَنظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝ اذْهَب بِّكِتَابِي هَٰذَا فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ ۝ (سورۃ النّمل۔ ۲۷، ۲۸)

"(سلیمان علیہ السّلام نے) کہا ابھی ہم دیکھ لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے، یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے، پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردِّ عمل ظاہر کرتے ہیں"!

یہاں پہنچ کر ہُدہُد کا کردار ختم ہوتا ہے۔ عقلیت کے مدّعی حضرات نے بس بنا پر اسے پرندہ ماننے سے انکار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انھیں ایک پرندے کا اس قوّت مشاہدہ، قوّتِ تمیز اور قوّتِ بیان سے بہرہ ور ہونا بعید از امکان معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ملک پر گزرے اور یہ جان لے کہ یہ قوم سبا کا ملک ہے، اس ملک کا نظامِ حکومت یہ ہے اس کی فرمانروا عورت ہے، اس کا مذہب آفتاب پرستی ہے، اس کو خدائے واحد کا پرستار ہونا چاہیئے تھا، مگر یہ گمراہی میں مبتلا ہے، اور اپنے یہ سارے مشاہدات وہ آکر اس فصاحت کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السّلام سے بیان کر دے۔ انہی وُجوہ سے کُھلے کُھلے ملاحدہ قرآن پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کلیلہ دمنہ کی سی باتیں کرتا ہے۔ اور قرآن کی عقلی تفسیریں کرنے والے اس کے الفاظ کو اُن کے صریح معنی سے پھیر کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ حضرت ہدہد

تو سرے سے کوئی پرندے ملتے ہی نہیں۔ لیکن ان دونوں قسم کے حضرات کے پاس آخر وہ کیا سائنٹیفک معلومات ہیں جن کی بنا پر وہ قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہوں کہ حیوانات اور اُن کے مختلف انواع اور پھر ان کے مختلف افراد کی قوتیں اور استعدادیں کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ جن چیزوں کو وہ معلومات سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت اس نہایت ناکافی مشاہدے سے اخذ کردہ نتائج ہیں، جو محض سرسری طور پر حیوانات کی زندگی اور ان کے برتاؤ کا کیا گیا ہے۔ انسان کو آج تک کسی یقینی ذریعہ سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مختلف قسم کے حیوانات کیا جانتے ہیں، کیا کچھ دیکھتے اور سُنتے ہیں، کیا محسوس کرتے ہیں، کیا سمجھتے اور سوچتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا ذہن کس طرح کام کرتا ہے پھر بھی جو تھوڑا بہت مشاہدہ مختلف انواع حیوانی کی زندگی کا کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی نہایت حیرت انگیز استعدادوں کا پتہ چلتا ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ جو ان حیوانات کا خالق ہے، ہم کو یہ بتاتا ہے کہ اُس نے اپنے ایک نبی کو جانوروں کی منطق سمجھنے اور اُن سے کلام کرنے کی قابلیت عطا کی تھی، اور اس نبی کے پاس سدھائے جانے اور تربیت پانے سے ایک ہُدہُد اس قابل ہو گیا تھا کہ دوسرے ملکوں سے یہ کچھ مشاہدے کر کے آتا اور پیغمبرؑ کو اُن کی خبر دیتا تھا، تو بجائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اس بیان کی روشنی میں حیوانات کے متعلق اپنے آج تک کے تھوڑے سے علم اور بہت سے قیاسات پر نظر ثانی کریں۔ یہ کیا عقل مندی ہے کہ ہم اپنے اس ناکافی علم کو معیار قرار دے کر اللہ تعالیٰ کے اس بیان کی تکذیب یا اُس کی معنوی تحریف کرنے لگیں۔

(سورۃ النمل۔ حاشیہ ۲۶، تفہیم القرآن جلد سوم)

شہد کی مکھی اور شانِ ربوبیّت

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (النحل۔ ۶۸، ۶۹)

"اور دیکھو، تمہارے ربّ نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کردی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں، اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا، اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے ربّ کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے، جس میں شفا ہے لوگوں کے لئے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں!"

"ربّ کی ہموار کی ہوئی راہوں!" کا اشارہ اِس پورے نظام اور طریقِ کار کی طرف ہے جس پر شہد کی مکھیوں کا ایک گروہ کام کرتا ہے۔ اُن کے چھتوں کی ساخت، اُن کے گروہ کی تنظیم، ان کے مختلف کارکنوں کی تقسیمِ کار، اُن کی فراہمی غذا کے لئے پیہم آمدورفت، ان کا باقاعدگی کے ساتھ شہد بنا بنا کر ذخیرہ کرتے جانا، یہ سب وہ راہیں ہیں جو اُن کے عمل کے لئے اُن کے ربّ نے اس طرح ہموار کردی ہیں کہ انہیں کبھی سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بس ایک مقرّر نظام ہے جس پر ایک لگے بندھے طریقے پر شکر کے یہ بے شمار چھوٹے چھوٹے کارخانے ہزارہا برس سے کام کئے چلے جا رہے ہیں۔

(سورۃ النحل۔ حاشیہ۔ ۵۷، تفہیم القرآن جلد دوم)

شہد کا ایک مفید اور لذیذ غذا ہونا تو ظاہر ہے، اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ البتّہ اس کے اندر شفا ہونا نسبتاً ایک مخفی بات ہے، اس لئے اس پر متنبّہ کردیا گیا۔ شہد اوّل تو بعض امراض میں بجائے خود مفید ہے، کیونکہ اس کے اندر پھولوں اور پھلوں کا رس، اور اُن کا گلوکوز اپنی بہترین شکل میں موجود ہوتا ہے۔ پھر شہد کا یہ خاصّہ کہ وہ خود بھی نہیں سڑتا اور دوسری چیزوں کو بھی اپنے اندر ایک مدّت تک محفوظ رکھتا ہے، اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ دوائیں تیار کرنے میں اس سے مدد لی جائے۔ چنانچہ الکوہل کے بجائے دُنیا کے فنِ دوا سازی میں وہ صدیوں اسی غرض کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ مزید برآں شہد کی مکھی اگر کسی ایسے علاقے میں کام کرتی ہے، جہاں کوئی خاص جڑی بوٹی کثرت سے پائی جاتی ہو۔ تو اس علاقے کا شہد محض شہد ہی نہیں ہوتا بلکہ اس جڑی بوٹی کا بہترین جوہر بھی ہوتا ہے۔ اور اس مرض کے لئے مفید ہوتا ہے، جس کی دوا اس جڑی بوٹی میں خدا

نے پیدا کی ہے۔ شہد کی مکھی سے یہ کام اگر باقاعدگی سے لیا جائے، اور مختلف نباتی دواؤں کے جوہر اس سے نکلوا کر ان کے شہد علیحدہ علیحدہ محفوظ کئے جائیں تو ہمارا خیال ہے کہ یہ شہد لیبارٹریوں میں نکالے ہوئے جوہروں سے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔

(سورہ النحل - حاشیہ - ۵۸ - تفہیم القرآن جلد دوم)

شہد کی مکھیوں کی خلقت گواہی دے رہی ہے کہ ایک حکیم اور ربِّ رحیم نے ان چیزوں کو ڈیزائن کیا ہے۔ سورہ النحل حاشیہ ۵۹ - تفہیم القرآن جلد دوم

سیّاروں میں زندگی کے امکانات

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ ۔ (النحل-۴۹)

"زمین اور آسمانوں میں جس قدر جاندار مخلوقات ہے اور جتنے ملائکہ ہیں، سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں!

زمین ہی کی نہیں آسمانوں کی بھی وہ تمام ہستیاں جنکو قدیم زمانے سے لے کر آج تک لوگ دیوی، دیوتا اور خدا کے رشتہ دار ٹھہراتے آئے ہیں، دراصل غلام اور تابعدار ہیں ان میں سے بھی کسی کا خداوندی میں کوئی حصّہ نہیں۔ ضمناً اس آیت سے ایک اشارہ اس طرف بھی نکل آیا کہ جاندار مخلوقات صرف زمین ہی میں نہیں ہیں، بلکہ عالمِ بالا کے سیّاروں میں بھی ہیں۔ یہی بات سورۂ شوریٰ آیت ۲۹ میں ارشاد ہوئی ہے:

"اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش، اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں!"

(سورۃ النحل - حاشیہ - ۴۲ - تفہیم القرآن جلد دوم -)

یعنی زمین میں بھی اور آسمانوں میں بھی - یہ کھلا اشارہ ہے اس طرف کہ زندگی صرف زمین پر ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ دوسرے سیاروں میں بھی جاندار مخلوقات موجود ہیں۔

سورہ الشوریٰ حاشیہ - ۵۰ - تفہیم القرآن جلد چہارم

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ

"اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند!"

"انہی کے مانند!" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جتنے آسمان بنائے اتنی ہی زمینیں بھی بنائیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے متعدد آسمان اس نے بنائے ہیں، ویسی ہی متعدد زمینیں بھی بنائی ہیں۔ اور "زمین کی قسم سے!" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ زمین، جس پر یہ انسان رہتے ہیں اپنی موجودات کے لئے فرش اور گہوارہ بنی ہوئی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اور زمینیں بھی تیار کر رکھی ہیں۔ جو اپنی اپنی آبادیوں کے لئے فرش اور گہوارہ ہیں۔ بلکہ بعض مقامات پر تو قرآن میں یہ اشارہ بھی کر دیا گیا ہے کہ جاندار مخلوقات صرف زمین ہی پر نہیں ہیں، عالم بالا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر آسمان میں جو بے شمار تارے اور سیارے نظر آتے ہیں، یہ سب ڈھنڈار پڑے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ زمین کی طرح اُن میں بھی بکثرت ایسے ہیں، جن میں دُنیائیں آباد ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حال میں امریکہ کے RAND CORPORATION نے فلکی مشاہدات سے اندازہ لگایا ہے کہ زمین جس کہکشاں (GALAXY) میں واقع ہے صرف اسی کے اندر تقریباً ۶۰ کروڑ ایسے سیارے پائے جاتے ہیں، جن کے طبعی حالات ہماری سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں اور امکان ہے کہ اُن کے اندر بھی جاندار مخلوق آباد ہو ——

(اکانومسٹ، لندن۔ مورخہ ۲۶، جولائی ۶۹ء)

(سورہ الطلاق حاشیہ۔ ۲۳۔ تفہیم القرآن جلد پنجم)

مچھلی کے پیٹ میں حضرت یونسؑ کے زندہ رہنے کا امکان

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿ (الصّٰفّٰت۔۱۴۵)

"آخر کار ہم نے اُسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا!"

جب حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور وہ ایک بندۂ مومن و قانت کی طرح اس کی تسبیح میں لگ گئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلی نے ان کو ساحل پر اُگل دیا۔ ساحل ایک چٹیل میدان تھا، جس میں کوئی روئیدگی نہ تھی، نہ کوئی ایسی چیز تھی جو حضرت یونسؑ پر سایہ کرتی، نہ وہاں غذا کا کوئی سامان موجود تھا۔

اس مقام پر بہت سے عقلیت کے مدّعی حضرات یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں جا کر کسی انسان کا زندہ نکل آنا غیر ممکن ہے۔ لیکن پچھلی ہی صدی کے اواخر میں اس نام نہاد عقلیت کے گڑھ (انگلستان) کے سواحل سے قریب ایک واقعہ پیش آچکا ہے، جو اُن کے

دعوے کی تردید کر دیتا ہے۔ اگست ۱۸۹۱ء میں ایک جہاز (STAR OF THE EAST) پر کچھ مچھیرے وہیل کے شکار کے لئے گہرے سمندر میں گئے۔ وہاں انہوں نے ایک بہت بڑی مچھلی کو جو ۲۰ فیٹ لمبی، ۵ فیٹ چوڑی، اور ۱۰۰ ٹن وزنی تھی، سخت زخمی کر دیا۔ مگر اس سے جنگ کرتے ہوئے جیمز بارٹلے نامی ایک مچھیرے کو اس کے ساتھیوں کی آنکھوں کے سامنے مچھلی نے نگل لیا۔ دوسرے روز ہی مچھلی اس جہاز کے لوگوں کو مری ہوئی مل گئی۔ انہوں نے بمشکل اسے جہاز پر چڑھایا اور پھر طویل جدّوجہد کے بعد جب اس کا پیٹ چاک کیا تو بارٹلے اس کے اندر سے زندہ برآمد ہو گیا۔ یہ شخص مچھلی کے پیٹ میں پورے ساڑھے گھنٹے رہا تھا۔ (اُردو ڈائجسٹ، فروری ۱۹۶۴ء) غور کرنے کی بات ہے کہ اگر معمولی حالات میں فطری طور پر ایسا ہونا ممکن ہے تو غیر معمولی حالات میں اللہ تعالیٰ کے معجزے کے طور پر ایسا ہونا کیوں غیر ممکن ہے؟

رَبُّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ۔ (المعارج - ۴۰)

"پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی!"

یہاں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔ مشرقوں اور مغربوں کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ سال کے دوران میں سورج ہر روز ایک نئے زاویے پر غروب ہوتا ہے۔ نیز زمین کے مختلف حصّوں پر سورج الگ الگ اوقات میں پے در پے طلوع اور غروب ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان اعتبارات سے مشرق اور مغرب ایک نہیں ہیں، بلکہ بہت سے ہیں۔ ایک دوسرے اعتبار سے شمال اور جنوب کے مقابلے میں ایک جہت مشرق ہے اور دوسری جہت مغرب۔ اس بنا پر سورۂ شعراء آیت ۲۸، اور مزّمّل آیت ۹ میں "ربّ المشرق والمغرب" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک اور لحاظ سے زمین کے دو مشرق اور مغرب ہیں۔ کیونکہ جب زمین کے ایک نصف کُرے پر سورج غروب ہوتا ہے تو دوسرے پر طلوع ہوتا ہے۔

(سورہ المعارج حاشیہ ۲۸، تفہیم القرآن جلد ششم)

اس بنا پر سورۃ الرّحمٰن، آیت ۱۷ میں "ربّ المشرقین وربّ المغربین!"

کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ سورۃ الصّٰفّٰت حاشیہ ۳ میں تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"سورج ہمیشہ ایک ہی مطلع سے نہیں نکلتا بلکہ ہر روز ایک نئے زاویے سے طلوع ہوتا ہے۔ نیز ساری زمین پر وہ بیک وقت طالع نہیں ہو جاتا، زمین کے مختلف حصّوں پر مختلف اوقات میں اس کا طلوع ہوا کرتا ہے۔ اِن وجوہ سے مشرق کے بجائے مشارق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ مغارب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ مشارق کا لفظ خود ہی مغارب پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم ایک جگہ ربّ المشارق والمغارب کے الفاظ بھی لائے ہیں۔ (المعارج۔ ۴۰)

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۝ (الرّحمٰن۔ ۱۷)

"دونوں مشرق اور دونوں مغرب، سب کا مالک و پروردگار وہی ہے!"

دو مشرقوں اور دو مغربوں سے مراد جاڑے کے چھوٹے چھوٹے دن اور گرمی کے بڑے بڑے دن کے مشرق و مغرب بھی ہو سکتے ہیں۔ اور زمین کے دونوں نصف کُروں کے مشرق و مغرب بھی۔ جاڑے کے سب سے چھوٹے دن میں سورج ایک نہایت تنگ زاویہ بنا کر طلوع و غروب ہوتا ہے اور اس کے برعکس گرمی کے سب سے بڑے دن میں وہ انتہائی وسیع زاویہ بناتے ہوئے نکلتا اور ڈوبتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہر روز اس کا مطلع اور مغرب مختلف ہوتا رہتا ہے۔ جس کے لئے ایک دوسرے مقام پر ربّ المشارق والمغارب کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اسی طرح زمین کے ایک نصف کُرے میں جس وقت سورج طلوع ہوتا ہے، اس وقت دوسرے نصف کُرے میں وہ غروب ہوتا ہے۔ یوں بھی زمین کے دو مشرق اور دو مغرب بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان دونوں مشرقوں اور مغربوں کا ربّ کہنے کے کئی معنی ہیں۔ ایک یہ کہ اسی کے حکم سے سورج طلوع و غروب اور سال کے دَوران میں ان کے مسلسل بدلتے رہنے کا یہ نظام قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ زمین اور سورج کا مالک و فرمانروا وہی ہے ورنہ ان دونوں کے ربّ الگ الگ ہوتے تو زمین پر سورج کے طلوع و غروب کا یہ باقاعدہ نظام کیسے قائم ہو سکتا تھا، اور دائم کیسے رہ سکتا تھا۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک و پروردگار وہی ہے۔ ان کے درمیان بسنے والی مخلوقات

اس کی ملک ہیں، وہی ان کو پال رہا ہے، اور اسی پرورش کے لئے اس نے زمین پر سورج کے ڈوبنے اور نکلنے کا یہ حکیمانہ نظام قائم کیا ہے۔

سورہ الرحمٰن - حاشیہ - ۱۷، تفہیم القرآن جلد پنجم۔

قیامت کے روز سمندر میں آگ، اللہ کی قدرت!

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ (التکویر-۶)

"اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں!"

اصل میں لفظ سُجِّرَتْ استعمال کیا گیا ہے جو تسجیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ تسجیر عربی زبان میں تنور کے اندر آگ دہکانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قیامت کے روز سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ لیکن اگر پانی کی حقیقت لوگوں کی نگاہ میں ہو تو اس میں کوئی چیز بھی قابلِ تعجب محسوس نہ ہوگی۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے کہ اُس نے آکسیجن اور ہائیڈروجن، دو ایسی گیسوں کو باہم ملایا، جن میں سے ایک آگ بھڑکانے والی اور دوسری بھڑک اٹھنے والی ہے اور ان دونوں کی ترکیب سے پانی جیسا مادّہ پیدا کیا، جو آگ بجھانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک اشارہ اس بات کے لئے بالکل کافی ہے کہ وہ پانی کی اس ترکیب کو بدل ڈالے اور یہ دونوں گیسیں ایک دوسرے سے الگ ہو کر بھڑکنے اور بھڑکانے میں مشغول ہو جائیں، جو اُن کی اصل بنیادی خاصیت ہے۔

(سورۃ التکویر- حاشیہ - ۶، تفہیم القرآن جلد ششم)

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ (الانفطار-۳)

"اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے!"

سورۃ التکویر میں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں میں آگ بھڑکا دی جائے گی، اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا۔ دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے، اور یہ بات بھی نگاہ میں رکھی جائے کہ قرآن کی رُو سے قیامت کے روز ایک ایسا زبردست زلزلہ آئے گا، جو کسی علاقے تک محدود نہ ہوگا، بلکہ پوری زمین بیک وقت ہلا دی جائے گی، تو سمندروں کے پھٹنے اور اُن میں آگ بھڑک اُٹھنے کی کیفیت ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ

پہلے اس عظیم زلزے کی وجہ سے سمندروں کی تہہ پھٹ جائے گی، اور ان کا پانی زمین کے اس اندرونی حصّے میں اترنے لگے گا، جہاں ہر وقت ایک بے انتہا لاوہ کھولتا رہتا ہے۔ پھر اس لاوے تک پہنچ کر پانی اپنے اِن دو ابتدائی اجزاء کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا جن میں سے ایک، یعنی آکسیجن جلانے والی اور دوسری یعنی ہائیڈروجن بھڑک اٹھنے والی ہے۔ اور یوں تحلیل اور آتش افروزی کا ایک مسلسل ردِّ عمل (CHAIN REACTION) شروع ہو جائے گا، جس سے دُنیا کے تمام سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ یہ ہمارا قیاس ہے باقی صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

وضعِ حمل کی مدّت اور جدید طبّی تحقیقات

وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ط (الاحقاف - ۱۵)

"اور اُس کے حمل اور دُودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے!"

- سورۂ بقرہ آیت ۲۳۳ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

"مائیں اپنے بچّوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اُس باپ کے لئے جو رضاعت کی پوری مدّت تک دُودھ پلوانا چاہے!"

- سورۂ لقمان آیت ۱۴ میں فرمایا: "اور دو سال اُس کے دُودھ چھوٹنے میں لگے!"
- اور سورۂ احقاف ۱۵ میں فرمایا:

"اُس کے حمل اور اُس کا دُودھ چھُڑانے میں تیس مہینے لگے!"

اب اگر تیس مہینوں میں سے رضاعت کے دو سال نکال دیئے جائیں تو حمل کے چھ مہینے رہ جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حمل کی کم سے کم مدّت جس میں زندہ سلامت بچّہ پیدا ہو سکتا ہے، چھ مہینے ہے ..... !

اس مقام پر یہ جان لینا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ جدید ترین طبّی تحقیقات کی رُو سے ماں کے پیٹ میں ایک بچّے کو کم از کم ۲۸ ہفتے درکار ہوتے ہیں۔ جن میں وہ نشوونما پاکر زندہ ولادت کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہ مدّت ساڑھے چھ مہینے سے کچھ زیادہ بنتی ہے۔ اسلامی قانون میں نصف مہینے کے قریب مزید رعایت دی گئی ہے۔ کیونکہ ایک عورت کا زانیہ قرار پانا اور بچّے کا نسب سے محروم ہو جانا بڑا سخت معاملہ ہے، اور اس کی

نزاکت یہ تقاضا کرتی ہے کہ ماں اور بچّے دونوں کو اس کے قانونی نتائج سے بچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش دی جائے۔ علاوہ بریں کسی طبیب، کسی قاضی، حتّٰی کہ خود حاملہ عورت اور اسے بار ور کرنے والے مرد کو بھی ٹھیک ٹھیک یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ استقرارِ حمل کس وقت ہوا ہے۔ یہ بات بھی اس امر کی متقاضی ہے کہ حمل کی کم از کم قانونی مدّت کے تعیّن میں چند روز کی مزید گنجائش رکھی جائے۔

مادّۂ تولید کی پیدائش

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ (الطّارق۔ ۶، ۷)

"ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے!"

اصل میں صُلب اور ترائب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ صُلب ریڑھ کی ہڈّی کو کہتے ہیں۔ اور ترائب کے معنی ہیں سینے کی ہڈّیاں یعنی پسلیاں۔ چونکہ عورت اور مرد دونوں کے مادّۂ تولید، انسان کے اس دھڑ سے خارج ہوتے ہیں، جو صُلب اور سینے کے درمیان واقع ہے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ انسان اس پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یہ مادّہ اس صورت میں بھی پیدا ہوتا ہے جب کہ ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ انسان کے پورے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ درحقیقت جسم کے اعضائے رئیسہ اس کے ماخذ ہیں، اور وہ سب آدمی کے دھڑ میں واقع ہیں۔ دماغ کا الگ ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ صُلب دماغ کا وہ حصّہ ہے، جس کی بدولت ہی جسم کے ساتھ دماغ کا تعلّق قائم ہوتا ہے۔

(سورہ الطارق۔ حاشیہ ۳، تفہیم القرآن جلد ششم)

سورۂ طارق آیات ۶، ۷ کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ ہم نے حاشیہ ۳ میں لکھا ہے اس پر ایک ڈاکٹر صاحب نے ہمیں لکھا ہے کہ: "آپ کی تشریح میں نے بغور کافی دفعہ پڑھی ہے، لیکن میں سمجھ نہ سکا۔ جہاں تک عملی مشاہدے کا تعلّق ہے تو یہ مادّہ فوطے (TESTICLES) میں پیدا ہوتا ہے اور باریک باریک نالیوں کے ذریعے بڑی نالیوں سے گذرتا

ہوا پیٹ کی دیوار میں کولہے کی ہڈی کے عین متوازی ایک نالی — (INGUINAL CANAL) میں سے گذر کر قریب ہی ایک غدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ غدود کا نام (PROSTATE) ہے۔ اور پھر وہاں سے رطوبت لے کر اس کا اخراج ہوتا ہے۔ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان سے اس کے گذرنے کو میں سمجھ نہ سکا۔ البتہ اس کا کنٹرول ایک ایسے نروس سسٹم سے ہوتا ہے جو کہ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان جال کی صورت میں پھیلا ہوا ہے، وہ بھی ایک خاص حد تک۔ اس کا کنٹرول ایک اور غدود جو کہ دماغ میں ہوتا ہے، کی رطوبت سے ہوتا ہے۔ لیکن یہاں سوال اخراج کا ہے (جو کہ ایک نالی کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے) میری درخواست ہے کہ آپ مجھے مفصل لکھیں کہ اس کی تفسیر کیا ہے۔ میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے (جس کے لئے معذرت خواہ ہوں) کہ آپ سائنٹیفک علم پر یقین رکھتے ہیں!"

اس کے جواب میں ہم نے نومبر ۱۹۷۱ء کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں لکھا ہے کہ: "آپ چونکہ ایک ڈاکٹر ہیں اس لئے اس بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگرچہ جسم کے مختلف حصوں کے افعال (FUNCTIONS) الگ الگ ہیں۔ لیکن کوئی حصہ بھی بجائے خود تنہا کوئی فعل نہیں کرتا بلکہ دوسرے اعضاء کے تعامل (CO-ORDINATION) سے اپنا کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ مادہ منویہ بننے کی جگہ بلاشبہ طوفہ ہے۔ اور وہاں سے اس کا اخراج بھی ایک خاص راستے سے ہوتا ہے۔ لیکن معدہ، جگر، پھیپھڑے، دل، دماغ، گردے اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا مادہ منویہ کے بننے اور نکلنے کا یہ نظام بطورِ خود اپنا کام کر سکتا ہے؟ اسی طرح مثال کے طور پر دیکھئے پیشاب گردے میں بنتا ہے اور ایک نالی کے ذریعے مثانے میں پہنچ کر پیشاب کے راستے خارج ہوتا ہے۔ مگر کس چیز کے نتیجے میں؟ خون بنانے والے اور اس کو سارے جسم میں گردش دے کر گردے تک پہنچانے والے اعضاء اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا تنہا گردہ خون سے وہ مادے الگ کر کے مثانے میں بھیج سکتا ہے، جن کے مجموعے کا نام پیشاب ہے؟ اس لئے قرآن مجید میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ یہ مادہ ریڑھ کی ہڈی اور سینے کی ہڈیوں سے نکلتا ہے۔ بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ: "ان دونوں کے درمیان جسم کا جو حصہ واقع ہے اس سے یہ مادہ خارج ہوتا ہے"۔ یہ اس بات کی نفی ہے کہ مادہ منویہ کے بننے اور اس کے اخراج کا ایک خاص نظامِ عمل

(MECHANISM) ہے جسے جسم کے کچھ خاص حصے انجام دیتے ہیں۔ بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظامِ عمل مستقل بالذّات نہیں ہے۔ یہ اپنا کام اس پورے نظام اعضاء کے مجموعی عمل کی بدولت انجام دیتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے صُلب اور ترائب کے درمیان رکھ دیا ہے۔ اسی لئے میں نے یہ وضاحت کی ہے کہ پورا جسم اس میں شامل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں تب بھی یہ نظام کام کرتا رہتا ہے۔ البتہ صُلب اور ترائب کے درمیان جو اعضائے رئیسہ واقع ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہے تو یہ نظام اپنا عمل جاری نہیں رکھ سکتا!"

اس سوال و جواب کو پڑھنے کے بعد دو مختلف مقامات سے دو ڈاکٹروں نے ہمیں جو طبّی معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

علم الجنین (EMBRYOLOGY) کی رُو سے ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جنین جسے (FOETUS) کے اندر انثیین (TESTES) یعنی وہ غدود جن سے مادّہ منویہ پیدا ہوتا ہے، ریڑھ کی ہڈّی اور پسلیوں کے درمیان گُردوں کے قریب ہوتے ہیں، جہاں سے بعد میں یہ آہستہ آہستہ فوطوں میں اُتر جاتے ہیں۔ یہ ولادت سے پہلے اور بعض اوقات اس کے کچھ بعد ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے اعصاب اور رگوں کا منبع ہمیشہ وہی مقام (بَیْنَ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ) ہی رہتا ہے۔ بلکہ ان کی شریان (ARTERY) پیٹھ کے قریب شہ رگ (AORTA) سے نکلتی ہے اور پورے پیٹ کا سفر طے کرتی ہوئی ان کو خون مہیّا کرتی ہے۔ اس طرح حقیقت میں انثیین پیٹھ ہی کا جُزء ہیں، جو جسم کا زیادہ درجۂ حرارت برداشت نہ کرنے کی وجہ سے فوطوں میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ علاوہ بریں مادّہ منویہ اگرچہ انثیین پیدا کرتے ہیں اور وہ کیسہ منویہ (SEMINAL VESICLES) میں جمع ہوجاتا ہے۔ مگر اس کے اخراج کا مرکز تحریک بین الصلب والترائب ہی ہوتا ہے، اور دماغ سے اعصابی رَو جب اس مرکز کو پہنچتی ہے، تب اس مرکز کی تحریک (TRIGERACTION) سے کیسہ منویہ سکڑتا ہے اور اس سے ماءِ دافق پچکاری کی طرح نکلتا ہے۔ اس لئے قرآن کا بیان ٹھیک ٹھیک علمِ طب کی جدید تحقیقات کے مطابق ہے۔

(ضمیمہ ۴، بسلسلہ سورۃ الطارق تفہیم القرآن جلد ششم)

موتی اور مونگے سمندر میں کس جگہ بنتے ہیں؟

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۚ (الرحمٰن-۲۲)

"اُن سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں!"

اصل الفاظ ہیں یَخْرُجُ مِنْهُمَا : "اُن دونوں سمندروں سے نکلتے ہیں" معترضین اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ موتی اور مونگے صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں، پھر یہ کیسے کہا گیا کہ میٹھے اور کھاری دونوں پانیوں سے یہ چیزیں نکلتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سمندروں میں میٹھا اور کھاری دونوں طرح کا پانی جمع ہوجاتا ہے۔ اس لئے خواہ یہ کہا جائے کہ دونوں کے مجموعہ سے یہ چیزیں نکلتی ہیں، یا یہ کہا جائے کہ وہ دونوں پانیوں سے نکلتی ہیں، بات ایک ہی رہتی ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ مزید تحقیقات سے یہ ثابت ہو کہ اِن چیزوں کی پیدائش سمندر میں اُس جگہ ہوتی ہے جہاں اُس کی تہہ سے میٹھے پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں، اور اُن کی پیدائش اور پرورش میں دونوں طرح کے پانیوں کے اجتماع کا کچھ دخل ہے بحرین میں جہاں قدیم ترین زمانے سے موتی نکالے جا رہے ہیں، وہاں تو یہ بات ثابت ہے کہ خلیج کی تہہ میں میٹھے پانی کے چشمے موجود ہیں۔

سطحِ زمین پر پہاڑوں کی اِفادیّت

وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ۔ (النّحل-۱۵)

"اُس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے!"

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سطحِ زمین پر پہاڑوں کے اُبھار کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے زمین کی گردش اور اس کی رفتار میں انضباط پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر پہاڑوں کے اس فائدے کو نمایاں کر کے بتایا گیا ہے، جس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے تمام فائدے ضمنی ہیں، اور اصل فائدہ یہی حرکتِ زمین کو اضطراب سے بچا کر منضبط (REGULATE) کرتا ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

بقیہ از ص۳۱

ریسیتوران میں دو آسٹریلوی ہوابازوں نے لوگوں کو کشتیٔ نوح کی کئی تصاویر دکھائی تھیں ریڈیو آسٹریلیا کے مطابق نیوساؤتھ ویلز کے مقام "بورال" کی ایک خاتون نے جنگ کے زمانہ میں بتایا تھا کہ وہ شاہی فضائیہ کے ایک ایسے نوجوان ہواباز کو جانتی ہے جس نے "کوہِ ارارات" پر پرواز کی تھی اور کشتیٔ نوح کو قریب سے دیکھا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ جلد ہی ایک حادثہ میں ہلاک ہوگیا اور اس سے مزید معلومات حاصل نہ کی جا سکیں۔ ہوسکتا ہے یہ وہی ہواباز ہو جس نے انگلستان کے ریستوران میں کشتیٔ نوح کی تصاویر دکھائی تھیں۔

بقیہ از ص۳۶

تیسرے حصّے کی تیاری قاضی محمّد حسین جونپوری کو دی گئی۔ ان حضرات کے علاوہ شاہ ولی اللّٰہ محدّث دہلوی نے اپنی کتاب "انفاس العارفین" میں ملّا حامد جونپوری کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ انہیں بھی فتاویٰ کی تیاری کے سلسلے میں ایک چوتھائی کام سپرد کیا گیا۔

بے شک زمانے کی گاڑی کافی آگے جا چکی ہے۔ احوال وظروف میں حیرت انگیز تغیرات واقع ہوئے ہیں، البتّہ قانونِ اسلامی کی تشکیل جدید میں اس سے استفادہ کیا جا چکا ہے۔ کم از کم ہمیں ان ابتدائی مراحل کی تیاری کے لئے وقت کھونا نہیں ہوگا جن کو بحسن وخوبی طے کیا جا چکا ہے۔ بہرحال فتاویٰ عالمگیری قانونِ اسلامی کی تطبیق میں ایک جامع کوشش تھی جس میں ہماری رہنمائی کا سامان موجود ہے۔

بقیہ از ص۴۰

کے باوجود شریعِ شریعت کے لحاظ و اتّباع کا پل کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

حرفِ آخر : میں پیر صاحب کا متبع ہوں نہ شاگرد، نہ ہم عقیدہ اور نہ ہم مشرب۔ اس کے باوجود میں نے یہ چند شواہد اس لئے درج کر دیئے ہیں کہ قارئین کو ان کی انصاف پسندی اور سلامتِ طبع اور حق پژوہی کا اندازہ ہو سکے۔ علماء اور صوفیاء دونوں میں یہ صفت بہت کم پائی جاتی ہے اور بہرحال قابلِ ستائش ہے۔ فقط

صلی اللہ علیہ وسلم

نظامِ مصطفیٰ

کی نمایاں خصوصیات

اور

اِس کا نفاذ کیوں اور کیسے؟

— از —

جناب فرید احمد محبوب ترمذی
سینئر انسٹرکٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن لاہور

اس مضمون کے بارے میں اتنا عرض کر دونگا کہ ہمارے علماء کرام اور اکابرِ دین نے جو شمع روشن کر رکھی ہے اسی کی روشنی میں الفاظ کو ترتیب دینے کی یہ کوشش ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، انجمن خدام القرآن لاہور کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنکی تقاریر اور تصانیف سے میں نے رہنمائی حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ ہم سبکو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس کے دین کی سربلندی کیلئے کچھ کر سکیں۔ فرید احمد محبوب ترمذی

آجکل نظام مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی اصطلاح چل پڑی ہے۔ یہ نظام معاشرہ ہیں اسلام کا کلی نفاذ چاہتا ہے جس کے لئے اصل اصطلاح ہے اقامت دین یا دین کا قیام۔ مزید برآں نظام مصطفےٰ مجموعہ ہے بہت سے نظاموں کا۔ اس میں اسلام کا نظام اخلاق۔ نظام معیشت، نظام معاشرت، نظام سیاست، نظام عدل، نظام جنگ و صلح، نظام حکومت۔ غرضیکہ پورا نظام زندگی شامل ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں اور بھی تو بہت سی اقوام ہیں جو خدا کو مانتی ہیں اور اپنے اپنے طریقے پر اس کی عبادت بھی کرتی ہیں مگر انہوں نے تو اپنے مذاہب کو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر مسلمان ہی کیوں ایسا چاہتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ ان کا معاملہ ہم سے مختلف ہے وہ اس کے مدعی ہی نہیں کہ دینی رُخ سے ان کے پاس پوری زندگی کے لئے کوئی لائحہ عمل ہے ان کے ہاں دین کا کوئی تصور نہیں صرف مذہب کا ہے اور مذہب ان کی نظر میں ایک اخلاقی نصب العین ہے یا زیادہ سے زیادہ رُوحانی بلند مقامات و مراتب کے حصول کے لئے رُوحانیت یا رہبانیت کا ایک کورس ہے جس پر چل کر کوئی فرد ان مقامات کو حاصل کر سکتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام ایک مذہب ہی نہیں پورا دین ہے جس کے اندر کامل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں تو زندگی کے ایک ایک گوشے سے متعلق قانون، دستور، قواعد و ضوابط اور ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کے جس پہلو کو لیجئے وہاں حدود و قیود لگی ہوئی ہیں کہ یہ جائز ہے وہ ناجائز، یہ حلال ہے وہ حرام، یہ صحیح ہے وہ غلط، یہ کرو وہ نہ کرو وغیرہ وغیرہ۔ بات آگے بڑھانے سے پہلے مذہب اور دین کا فرق سمجھ لیجئے اور ساتھ ہی قرآن کی دو اصطلاحات **عبادتِ رب** اور **شہادتِ حق** کا مفہوم بھی سمجھ لیجئے تاکہ معاشرہ میں نظام اسلام کے نفاذ کی غرض و غایت واضح ہو جائے۔

مذہب اور دین دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ مگر پورے قرآن اور ذخیرہ احادیث میں اسلام کی تعبیر میں کسی جگہ لفظ مذہب استعمال نہیں ہوا بلکہ دین استعمال ہوا ہے۔ جو ہماری زبان کے لفظ نظام حیات کے مفہوم سے قریب ترین ہے۔ جدید ذہن اور فکر دین کو فرد کی زندگی کا ایک نجی معاملہ سمجھتے ہوئے اسے لفظ مذہب کے

مترادف سمجھتا ہے حالانکہ یہ تصور درست نہیں۔ مذہب کے لفظ سے جو تصور ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ "چند مابعد الطبعیات META PHYSICAL عقائد کا رکھنا اور ان عقائد کے تحت چند رسوم عبادت کی ادائیگی اور چند رسوم معاشرت کی پابندی اگر کی جائے تو مذہب کا تقاضہ پورا ہو گیا۔ یوں دین کو مذہب کی شکل دیکر آج کا پڑھا لکھا طبقہ اسے ایک انسان کی زندگی کا نجی معاملہ قرار دیتا ہے جسے نہ اجتماعی نظام سیاست سے کوئی تعلق ہے نہ معاشیات سے نہ باقی اجتماعی تقاضوں سے۔

عربی زبان میں لفظ دین کا اصل مفہوم ہے جزا و سزا یعنی بدلہ۔ چنانچہ سورہ فاتحہ میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے مالک یوم الدین (جزا و سزا کے دن کا مالک) ظاہر ہے جزا اور سزا کسی قانون اور ضابطے کے تحت ہی ہوتی ہے۔ لہذا جزا اور سزا کے ساتھ قانون اور ضابطہ کا تصور بھی ابھرتا ہے جسکی پیروی کی جائے اور اس تصور کے ساتھ یہ بھی لازماً ذہن میں آتا ہے کہ کوئی ایسا ادارہ یا ایسی ہستی ہے جو قانون عطا کرنے والی LAW GIVER ہے اور جو اطاعت چاہتی ہے۔ لہذا از روئے قرآن حکیم دین کے معنی ہیں "ایک پورا نظام زندگی اور مکمل ضابطہ حیات جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مقنن LAW GIVER اور حاکم مطلق SOVEREIGN مان کر اسکی جزا کی اُمید اور اس کی سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ یا جاری و نافذ کردہ قانون اور ضابطے کے مطابق اس ہستی کی کامل اطاعت کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے۔

اس مفہوم میں سُورۃ یوسف میں دین الملک کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ حضرت یوسف کے زمانے میں مصر میں بادشاہت کا نظام بادشاہ کی حاکمیت کی بنیاد پر قائم تھا۔ اور اصل حکمرانی بادشاہ کی تصور کی جاتی تھی اس لئے اسے دین الملک سے تعبیر کیا گیا۔

اس وضاحت کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کے آخری پارے کی سُورۃ نصر پر غور کیجئے:۔

اذا جاء نصر اللہ و الفتح ہ و رایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا ہ یعنی

جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہو گئی اور (اے نبی آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں -

" یہاں دین اللہ سے مراد ہے اللہ کو مطاع حاکم مطلق اور حقیقی مقنن تسلیم کر کے اسی کی جزا کی امید اور اسی کی سزا کا خوف رکھتے ہوئے صرف اسی کے قانون، اسی کے ضابطے اور اسی کی دی ہوئی شریعت کے مطابق انفرادی اور اجتماعی معاملات کو انجام دیا جائے - بالفاظ دیگر صرف اور صرف اسی کی اطاعت میں پوری زندگی کو جکڑ دیا جائے - اسی رویے اور طرز عمل کا نام ہے اللہ کے دین کے تحت زندگی گزارنا" اسی کا حکم قرآن میں ہے کہ اے ایمان والو! (اللہ کی) اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ -

نظام مصطفےٰ، دین اللہ کو انہی معنوں میں معاشرہ میں کلی طور پر انفرادی اور اجتماعی تقاضوں میں نافذ کرنا چاہتا ہے -

یہاں تک تو میں نے مذہب اور دین کے الفاظ کی وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا ہے کہ اسلام جو ایک دین ہے کیوں ہر شعبہ حیات میں اپنا غلبہ چاہتا ہے اور نظام اسلام یا نظام مصطفےٰ کے معنی کیا ہیں - اب آیئے ایک دوسرے سوال کی طرف کہ اس نظام یا دین اسلام کے تحت ہم پر بحیثیت مسلمان کیا انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جن پر پورا اترنے کے لئے پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ کی کوشش کی جا رہی ہے -

ہم بحمد اللہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ ہی ہمارا خالق اور رب ہے - وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں - اس نے بکمال مہربانی اپنے بندوں کی رہنمائی کے لئے اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے ذریعے احکامات نازل کئے اور حضور نبی اکرمؐ آخری نبی اور رسول ہیں اور ان پر آخری کتاب ہدایت قرآن کی شکل میں اتری جس کی تعلیمات پر حضورؐ نے عملاً چل کر دکھایا اور اسے معاشرہ میں ایک نظام حیات کی شکل میں نافذ فرمایا - ظاہر ہے ہمارے فرائض کا تعین بھی قرآن اور سُنت کی ہی روشنی میں ہو گا -

عبادت رَبّ اللہ اور اس کے رسول اکرمؐ کا دیا ہوا نظام حیات مسلمانوں سے جس اطاعت کلی کا متقاضی ہے وہ مارے باندھے کی

لہ مطالبات دین - (صفحہ نمبر ۹۱)

اطاعت نہیں بلکہ بکمال خوشی و رغبت و محبت یہ اطاعت مطلوب ہے۔ یہاں بندہ اپنی ہر مرضی اور خواہش کو اللہ کی مرضی کے سامنے پست کر دے۔ ایسی اطاعت کلی کے لئے قرآن ایک لفظ استعمال کرتا ہے وہ ہے عبادت رب۔ یہ قرآن کا بڑا مرکزی لفظ ہے۔ اور اس کی دعوت کا خلاصہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی رسول اور انبیاء مبعوث فرمائے گئے وہ اسی عبادت رب یعنی اللہ کی بندگی کی دعوت لے کر آئے۔ وہ سب ایک ہی دین پر تھے یعنی دین اسلام پر۔ اسی دین کی طرف وہ اپنی اپنی قوم کے افراد کو بلاتے رہے کہ لوگو! حاکم مطلق اور اصل مقتن اللہ ہے، وہی تمہارا خالق ہے۔ وہی تمہیں پالنے والا ہے۔ وہی تمہیں جزا اور سزا دینے والا ہے۔ لہذا اسی کی بندگی کرو، اسی کے سامنے بکمال محبت و شوق جھک جاؤ بچھ جاؤ۔ اسی کے احکامات کی پیروی کرو۔ جو وہ تمہیں انبیاء و رسل کے ذریعے بھیجتا رہا۔ موت کے بعد ایک دن تم اس کے حضور پیش کئے جاؤ گے اور جواب دہ ہو گے۔ اللہ کی توحید کے ساتھ ساتھ ملائکہ، نزول کتب، ارسال انبیاء، حشر و نشر، حساب و کتاب، جزا و سزا، جنت و دوزخ سب پر ایمان لاؤ۔ دین ایک ہی رہا شریعتیں مختلف رہیں۔ حالات کے بدلنے اور انسانی ذہن اس کی تہذیب و تمدن اور اس کے وسائل و ذرائع کی ترقی کے ساتھ ساتھ شریعت یعنی عملی زندگی کے احکام میں تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ یوں کہیئے کہ وہ دین جو اللہ تعالے نے گذشتہ انبیاء پر نازل کیا تھا وہ اپنی تکمیل کو پہنچا حضور خاتم النبیین والمرسلین حضرت محمدؐ پر جب شریعت الٰہی انسانی زندگی کے ہر انفرادی و اجتماعی پہلو کے بارے میں واضح احکامات اور رہنما اصول لے کر حضورؐ کے ذریعے مکمل صورت اختیار کر گئی۔ اس بات پر قرآن میں سورت مائدہ کی وہ چھوٹی سی آیت جو عین حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی مہر تصدیق ثبت کرتی ہے:۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ط یعنی ——

آج کے دن ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

یوں سمجھ لیجئے کہ دین اسلام کی کلی شریعت الٰہی کو لے کر بتدریجاً سابقہ انبیاء کرام کے ہاتھوں کھلتی رہی۔ حتیٰ کہ حضور خاتم النبیین والمرسلین کے مقام رسالت پر فائز ہونے سے وہ کلی تکمیل شریعت کے ساتھ ایک پورے پھول کی شکل اختیار کر گئی اور دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات کے طور پر بنی نوع انسان کے پاس پہنچ گیا۔

یاد رکھیں کہ شریعت کے احکامات مدنی سورتوں میں آئے ہیں مکی سورتوں میں نہیں حالانکہ قرآن حکیم کا کوئی دو تہائی حصہ مکی سورتوں پر مشتمل ہے۔ مکہ میں چونکہ مسلمانوں کی حیثیت ایک داعی جماعت کی تھی اور ان کے اپنے معاشرے یا ریاست کے قیام کا مرحلہ جو انہیں مدنی دور میں پیش آیا مکہ میں پیش نہیں آیا تھا اس لئے شریعت کے تفصیلی احکام بھی انہیں مدینے میں دیئے گئے۔ مکی سورتوں میں مسلمانوں کو توحید، ایمان، رسالت، آخرت اور اخلاق حسنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا۔ نیز حق و باطل کی کشمکش کے پس منظر میں جو اس وقت انتہائی شدت اختیار کر گئی تھی حضور سرور کائنات کو اور آپ کے جانثاروں کو صبر و تحمل کی تلقین بھی فرمائی گئی اور حالات کی مناسبت سے ضروری ہدایات بھی دی گئیں۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ تمام انبیاء اور مرسلین ایک ہی دین لیکر اور اللہ کی اطاعت و بندگی یعنی عبادت رب کی دعوت اپنی اپنی قوموں کو دیتے رہے جن کی طرف وہ مبعوث ہوئے تھے۔ ہر رسول اپنی دعوت کا آغاز یا قوم کہہ کر کرتا رہا۔ جتنی شریعت یعنی عملی زندگی کے بارے میں احکامات ان انبیاء کے زمانوں میں یہ دین اپنے اندر لے کر پہنچتا رہا وہ اپنی قوم کے افراد تک پہنچاتے رہے، خود بھی عمل پیرا ہوئے اور دوسروں کو بھی عمل کی دعوت دی۔ جب حضور نبی اکرم کے ذریعہ یہ دین پوری شریعت الٰہی لیکر پہنچ گیا تو دعوت دین کا خطاب کسی ایک قوم سے نہیں کیا گیا بلکہ پوری نوع انسانی کو مخاطب کر کے کہا گیا۔

یاایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون ۝ یعنی

اے بنی نوع انسان اس اللہ کی بندگی اختیار کرو۔ اطاعت کرو۔ اور پرستش جو تمہارا رب ہے اور جس نے تم سے پہلے ہو گزرنے والے انسانوں کو بھی پیدا کیا۔ تاکہ تم بچ سکو۔

یوں جانیئے کہ" جبتک دنیا نے تمدنی و اجتماعی زندگی کے وسائل نہیں پیدا کر لئے جو ساری دنیا کو ایک داعی حق کی دعوت پر جمع کرنے کے لئے ضروری تھے۔ اس وقت تک اللہ تعالےٰ نے الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کو بھیجنا جاری رکھا۔ لیکن جب انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی اور اجتماعی شعور اتنا بیدار ہو گیا کہ وہ ایک عالمگیر نظام عدل کے تحت زندگی بسر کر سکیں اور ساتھ ہی دنیا کے مادی وسائل اور اجتماع و تمدن نے بھی اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغام ہدایت دُنیا کے ہر گوشے میں بسہولت پہنچ سکے تو اللہ تعالےٰ کی رحمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء جناب محمد مصطفےٰ" کو بھیجے اور ان کے ذریعہ لوگوں کو وہ مکمل نظام زندگی عنایت فرمائے جو بنی نوع انسان کے مزاج اور ان کے حالات و ضروریات کے بالکل مطابق ہو۔ یہی خدائی نظام ہے جس کو ہم اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔

اس نظام زندگی کو جسے آپ نظام مُصطفےٰ کہہ لیجئے۔ حضور سرور کائنات نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی ایک وسیع خطۂ ارضی پر بالفعل قائم کر کے اسکی برکات لوگوں کے سامنے رکھ دیں تاکہ بنی نوع انسان پر ہمیشہ کے لئے اللہ کی حجت قائم ہو جائے اور قیامت کے روز انسان یہ نہ کہہ سکے کہ اسے تو اس کے انفرادی، سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کا کوئی متوازن اور معتدل حل ہی نہیں دیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ کس بات کے لئے جواب دہ ہو؟

نفس نبوّت کی رعایت سے تو جناب رسالت مآب باقی انبیاء کی طرح شاہد بھی تھے اور بشیر و نذیر بھی، داعی بھی تھے اور مزکّی بھی مگر حضورؐ کی امتیازی شان ہے خاتم النبین ہونے کی۔ یعنی نبوت و رسالت کے مقاصد کی تکمیل آپ کے ہاتھوں ہوئی۔ اور بنی نوع انسان کو قیامت تک جو اجتماعی مسائل پیش آنے والے تھے ان کے حل کے لئے رہنما اصول نہ صرف آپ نے قولاً بتائے بلکہ انہیں معاشرہ میں بالفعل نافذ کر کے بطور نمونہ دکھا دیا کہ اگر تمہیں اپنے عائلی

معاشرتی، سیاسی، معاشی، انتظامی یا اور کسی اجتماعی میدان میں کوئی کام کرنا ہے تو شریعت الٰہی کی مطابقت میں اسے کیسے سرانجام دیا جائے اور عبادت رب کا حق کیسے ادا کیا جائے۔

بدقسمتی سے ہم نے لفظ عبادت کے مفہوم کو محدود کر کے رکھ دیا اور صرف چند اعمال اور مراسم بندگی کی ادائیگی کا نام عبادت ربّ رکھ لیا۔ حالانکہ عبادت اس رویہ اور طرز عمل کا نام ہے جس سے انسان کی پوری زندگی برضا و رغبت اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں آجائے۔ اور عبادت کا یہ وسیع تر مفہوم متقاضی ہے ایک ایسے نظام زندگی کا جس میں انسان، اللہ کی خوشنودی کے لئے اس کے بتائے ہوئے طریق پر چلتے ہوئے انفرادی اور اجتماعی ذمّہ داریوں سے پوری طرح عہدابرآ ہو سکے۔

اس میں شک نہیں کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ہم پر فرض ہیں، ان کی ادائیگی عبادت رب میں شمار ہوتی ہے اور ان کی اہمیت اتنی اونچی ہے کہ ان سے کوتاہی سزا کا موجب ہوگی۔ مگر عبادت صرف یہی نہیں۔ اور اگر صرف ان کو ادا کر کے سمجھ لیا جائے کہ عبادت رب کا حق ادا ہو گیا تو دین کا تصور محدود ہی نہیں بلکہ مسخ ہو جائے گا اور یہ تصور اس وقت تک صحیح اور درست نہیں ہوگا جبتک کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عبادت پوری زندگی میں خدا کے سامنے بچھ جانے اور ہر گوشے اور ہر معاملے میں اللہ کے حکم کا بخوشی مطیع ہونے کا نام ہے۔ آپ خود سوچیے ایک شخص نماز بھی پڑھتا ہے، روزہ بھی رکھتا ہے، زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہے، فریضہ حج بھی پورا کر چکا ہے مگر عملی زندگی میں سمگلنگ، چور بازاری، دھوکہ دہی کرتا ہے، دوسروں کے حق غصب کرتا ہے، رشوت لیتا ہے، انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے رجسٹروں میں ہیر پھیر کرتا ہے تو کیا وہ واقعی عبادت رب کا حق ادا کر رہا ہے۔ اگر صرف نماز، زکوٰۃ، روزہ وغیرہ ہی کی ادائیگی سے عبادت رب کا حق ادا ہو جاتا تو پوری زندگی کو اللہ کی اطاعت میں دینے کی ضرورت نہ ہوتی۔ مگر اس معاملہ کو بھی احکم الحاکمین نے آخری پارہ کی صورت البیّنہ میں دور فرما دیا۔ سورۃ مبارکہ کے نام کے معنی ہی ہیں روشن دلیل جس کے بعد کسی انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ ارشاد باری ہے۔ (اہل کتاب کا ذکر فرماتے ہوئے):

اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں۔ اپنی اطاعت کو صرف اسی کے لئے خالص کر کے بالکل یک سو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں (یہی طرز عمل) نہایت صحیح درست دین (نظام زندگی) ہے۔

غور فرمائیے کہ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم علیحدہ ہے اور اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم علیحدہ۔ معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ جیسی فرض عبادت کے علاوہ بھی ایک اور عبادت انسان سے مطلوب ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان یک سو ہو کر مخلصانہ طور پر اپنی زندگی کا ہر گوشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دے اور اس کا پورا نظام زندگی اس ضابطہ اور ہدایت کے تحت آجائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل کے ذریعہ بنی نوع انسان تک پہنچایا۔

ظاہر ہے کہ عبادت رب کے اس وسیع تر مفہوم کے تحت ہمیں اپنے معاشرہ میں ایسا نظام لاگو کرنا ہوگا جو افراد کی زندگی کو اللہ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھال دے اور انہیں اپنے فریضہ عبادت کی ادائیگی میں مدد دے اس کے برعکس اگر ایسا نظام رائج ہو جائے جو لوگوں کو شریعت الٰہی سے دور لیجائے تو بار کس کی گردن پر ہوگا؟ مثال کے طور پر اگر نظام ایسا ہو جہاں سود کا کاروبار چل رہا ہے، رشوت ستانی عام ہو، معاشرہ میں لوگ اگر عزت و فضیلت دیکھیں تو ان افراد کی جن کے پاس پیسہ ہے۔ چاہے وہ پیسہ سمگلنگ اور چور بازاری سے اکٹھا ہوا اور یوں وہ پیسہ کی خاطر ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنے کی طرف راغب ہو جائیں۔ یا جہاں جنسی بے راہ روی پر کوئی قدغن نہ ہو اور چاروں طرف طاغوتی طاقتوں کی یلغار اپنے اندر ایسی جاذبیت اور کشش پیدا کر لیں کہ معاشرہ کے افراد احکامات الٰہیہ کو پس پشت ڈال کر اپنی نفسانی خواہشات کے چکروں میں پھنس جائیں تو سوچئے ایسے نظام کے بدلنے کی ضرورت ہوگی یا نہیں؟

شہادتِ حق

آیئے دین کی دوسری اصطلاح شہادت حق کی طرف۔ اسلام کا ایک عظیم مطالبہ اور تقاضا عبادت رب ہیں نے پہلے پیش کرنے کی کوشش کی ہے دوسرا اہم اور عظیم مطالبہ ہے شہادت حق

جس کے لئے پھر نظام مصطفٰےؐ کے نفاذ کی ضرورت ہے۔

سُورہ بقر کے ۱۷ ویں رکوع کی تیسری آیت کے ایک جز پر غور فرمائیے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ ط یعنی ——

(اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی اُمت (بہترین اُمت) بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسُول تم پر گواہی دینے والا بنے۔)

پہلے اس آیت کا پس منظر ذہن میں رکھیئے۔ سُورۃ بقر کے چوتھے رکوع سے چودھویں رکوع تک مسلسل ایک مضمون بنی اسرائیل کے متعلق چلا آرہا ہے۔ بنی اسرائیل درحقیقت ہم سے پہلے کے مسلمان ہیں اور ہم سے پہلے اُمت مسلمہ یہی بنی اسرائیل تھے اور شریعت محمدی سے پہلے کی شریعت، شریعت موسوی کہلاتی ہے۔ اس اُمت مسلمہ نے جس جس طرح سے احکامات خداوندی کی نافرمانی کی اور جس جس طرح اپنے فرائض سے کوتاہی کی اس کی ایک مسلسل فرد قرارداد جرم ان دس رکوعوں میں اللہ نے لگائی ہے اس کے بعد تحویل قبلہ کا ذکر ہے اور اللہ اعلان فرماتا ہے کہ اے بنی اسرائیل! ان جرائم کی پاداشں میں تم اُمت مسلمہ کے مقام و مرتبہ سے معزول کئے جارہے ہو اور اب ایک نئی اُمت تمہاری جگہ فائز کی جا رہی ہے اور وہ ہے اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس نئی اُمت کا قبلہ بھی تمہارے قبلہ بیت المقدس سے بدل کر بیت الحرام مقرر کیا جارہا ہے اور تمہارے قبلہ کو منسوخ کیا جارہا ہے۔ ساتھ ہی نئی امت مسلمہ کو متنبہ کردیا گیا کہ اس منصب پر فائز ہونا جہاں ایک بہت بڑا اعزاز ہے وہاں ایک بھاری ذمہ داری اور نازک فرض کی حیثیت بھی رکھتا ہے جس کے لئے وہ اللہ کے ہاں جوابدہ ہوں گے۔ اس کے بعد اٹھارویں رکوع کے اختتام سے شروع ہوتا ہے خطاب نئی اُمت مسلمہ سے بحیثیت اُمت مسلمہ کے۔ اسے کہا کہ "تم بہترین اُمت ہو جسے نوع انسانی کی رہنمائی کے لئے برپا کیا گیا ہے تاکہ تم ہو جاؤ گواہ تمام لوگوں پر اور رسول ہو جائیں گواہ تم پر۔ یعنی تمہارے پاس ہو گی اللہ کی ہدایت کی امانت (قرآن) اور نوع انسانی اس ہدایت سے استفادہ کرے گی۔ تم پر تبلیغ اور تعلیم کا حق ادا کردیا جناب محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے۔ انہوں نے حق کی شہادت اپنے

قول وعمل سے بھی دی - اور اسی حق کی شہادت ہی کے لئے اللہ کی اطاعت پر مبنی نظام زندگی بالفعل نافذ کر کے ایک نمونہ تمہارے سامنے پیش کر دیا - گویا کہ رسُول کی گواہی ہو گئی تم پر - اب تمہارے ذمہ ہے کہ اس مفہوم اور معنی میں بنی نوع انسانی پر تا قیام قیامت گواہی دو - تمہیں اب اللہ کی ہدایت اور اللہ کے دین کو عملاً نافذ کر کے دنیا کے سامنے حق کی شہادت دینی ہے -

اس فرمنی منصبی کی تاکید مزید سُورۃ النسا کی آیت ۱۳۵ میں یوں آئی ہے اے ایمان والو! پوری قوت و استقامت کے ساتھ عدل و انصاف کے علمبردار اور اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ - یہی تاکید الفاظ کی ترتیب کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۃ النسا سے اگلی سورۃ مائدہ کی آیت نمبر ۸ میں بھی آئی ہے - یوں سمجھیے کہ قرآن مجید کی پہلی چار طویل سُورتیں یعنی سُورہ بقر سے لے کر سُورۃ مائدہ تک جو نزولی اعتبار سے مدنی دور کی ہیں - اُمت مسلمہ کو ان کے فرائض منصبی یعنی عبادت رب اور شہادت حق کی ادائیگی کا حکم دے رہی ہیں اور ساتھ ہی شریعت کے احکام بتدریجاً دیئے جا رہے ہیں کہ ان فرائض کی ادائیگی میں مسلمانوں کو اپنے عائلی، معاشرتی اور ملی سطح کے معاملات کیسے طے کرنا ہیں -

ہمارے دین میں اس شہادت حق کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کا آغاز ہی اس لفظ سے ہوا اور ہم اس شہادت کی بنا پر اُمت مسلمہ میں شامل ہوئے جب ہم نے اشہدان لاالٰہ الااللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھا - ایک مرد مومن دین حق کی شہادت کے لئے زندگی بھر اپنی پوری صلاحیتیں اور قوتیں صرف کرتے ہوئے ضرورت پڑنے پر اپنی جان کا نذرانہ تک پیش کر دیتا ہے - ہم اسے شہید کہتے ہیں - اس کی آخری شہادت کی جو قدر و منزلت معبود حقیقی کی نظر میں ہے وہ آپ جانتے ہی ہیں -

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

یہ بات یاد رکھیں ہمیں صرف اپنے ہی مسائل کا حل ہدایت الٰہیہ کی رہنمائی میں نہیں ڈھونڈنا بلکہ بحیثیت اُمت مسلمہ نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی بھی کرنا ہے - مگر بدقسمتی سے ہم وہاں ہیں جہاں ہمیں خود اپنی ہی خبر نہیں - یہ

نصب العین ہی نظروں سے اوجھل ہے۔

اس اُمّت کے افراد کو حق کی شہادت صرف قولاً ہی نہیں عملاً دینا ہوگی۔ صرف انفرادی سطح پر نہیں۔ بلکہ اپنی ہیئت اجتماعیہ کی نسبت سے اجتماعی سطح پر بھی دینی ہوگی۔ جب تک ہماری اجتماعی زندگی ہمارے ملک کا نظام، ہمارا آئین و دستور، ہمارے تمام قوانین، ہماری معیشت، ہماری معاشرت، تہذیب و تمدّن، ہمارا آرٹ، ہمارا ادب، ہماری ثقافت غرضیکہ اجتماعی زندگی کا ہر شعبہ اور پہلو اللہ کے نازل کردہ دین و شریعت کے سانچے میں نہ ڈھل جائے۔ اس وقت تک اس اجتماعی عملی گواہی کا حق ادا نہ ہوگا۔ یہ جب ہی ممکن ہے جب اللہ کی اطاعت پر مبنی نظام حیات جسے آجکل آپ نظام اسلام یا نظام مصطفےٰ کہتے ہیں اپنی کامل شکل و صورت میں چلتا پھرتا نوع انسانی کے سامنے رکھا جائے۔

اس اُمت مسلمہ کے فرائض منصبی کی مزید وضاحت سورۃ آل عمران کی اس آیت میں کی گئی ہے۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنکر و تومنون باللہ۔ یعنی

تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لئے برپا کی گئی ہو۔ نیکی کا حکم دیتے ہوئے بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

شہادت حق کے اجتماعی پہلو کو کس طرح ادا کیا جائے اس کی وضاحت بھی اس سورہ میں بتائی ہے کہ اگر خدانخواستہ اُمّت بحیثیت مجموعی اس فریضے سے غفلت برتنے لگے تب بھی اُمت مسلمہ میں کم از کم ایک جماعت ایسی رہنی چاہیئے جو اسے اپنا مقصد زندگی اور فریضہ حیات بنائے۔ آیت متعلقہ کا ترجمہ ہے۔

اور چاہیئے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے۔ معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اس آیت کے مفہوم کی وضاحت کرتے

ہوئے لکھتے ہیں :-

" اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے آنحضرتؐ کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ٹھیک ٹھیک نبوت کے طریق پر خلافت کی بنیاد رکھی - یہ ادارہ نیکی کی دعوت، معروف کے حکم اور منکر سے روکنے کا ایک اجتماعی ادارہ تھا - INSTITUTION OF GOVERNMENT جو مسلمانوں نے اس لئے قائم کیا تھا کہ اس جماعتی فرض کو انجام دے سکیں جو آنحضرتؐ کے بعد اس اُمت کو حق پر استوار رکھنے اور دنیا کو حق کی دعوت دینے کے لئے اس اُمت پر ڈالا گیا تھا۔ جب تک یہ ادارہ صحیح طریقہ پر قائم رہا اور اپنے فرائض مسلمانوں کے اندر بھی اور مسلمانوں سے باہر بھی انجام دیتا رہا ہر مسلمان اس (اجتماعی) فرض سے سبکدوش رہا (انفرادی سطح پر اپنے قول و فعل سے اس کی گواہی دیتا رہا) لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہوگیا تو جس طرح کسی ملک کا سیاسی نظام درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کے باشندوں کے جان و مال کی ذمہ داری خود ان کے اوپر منتقل ہو جاتی ہے اور جب تک وہ از سر نو اپنے نظام سیاسی کو درست نہ کر لیں - ان میں سے ہر شخص اپنی حفاظت کا بوجھ خود اٹھاتا ہے - اسی طرح نظام خلافت (جو نظام اسلام لاگو کئے ہوئے تھا -) کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اب یہ فریضہ شہادت علی الناس (لوگوں پر حق کی گواہی دینا اور ان کے سامنے حق کا عملی نمونہ پیش کرنا) اس امت کے تمام افراد پر منتقل ہو گیا ہے اور وہ جب تک اس کو انجام دینے کے لئے اس صالح اسلامی نظام کو قائم نہ کریں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس وقت تک اس (اجتماعی) فریضہ کے ادا نہ کرنے کا گناہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور قیامت کے دن اس کی پرسش ہر شخص سے ہوگی، اب اس فرض کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لئے باقی رہ گئی ہیں یا تو اس ادارے کو قائم کریں (یعنی ایسا ادارہ حکومت قائم کریں جو معاشرہ میں نظام اسلام لاگو کر کے اس اجتماعی فریضہ کو پورا کرے) یا کم از کم اس کو قائم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔

سورۃ حج کی اس آیت پر بھی غور کریں جس کا ترجمہ ہے کہ :-

اگر ہم ان (مسلمانوں) کو غلبہ دیں تو وہ نماز قائم کریں گے - زکوٰۃ ادا

کریں گے ۔ نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں کو روک دیں گے ۔

اب پاکستان کی شکل میں اللہ نے ہمیں ایک خطہ ارضی دیا ہے جہاں ہمارا اپنا غلبہ ہے اور اپنی حکومت ہے ۔ اب از روئے قرآن ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ نہ صرف اپنی انفرادی زندگی کے ہر شعبے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کلی (عبادت رب) ایسے طریق پر کرے کہ اس کا قول و عمل اس بات کی شہادت دے کہ یہ واقعی اللہ کا اطاعت گزار بندہ ہے بلکہ اپنے اجتماعی فریضہ یعنی دوسروں کو نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا اور تمام بنی نوع انسان کے سامنے اسوۂ حسنہ کا عملی نمونہ پیش کرنے کے لئے مسلمان ایسا نظام حیات معاشرہ قائم کرے کہ وہ اسلامی نظام حیات اس بات کی شہادت دے کہ انسانوں کی فلاح و بہبود اگر ہو سکتی ہے تو صرف اللہ کے دین کی پیروی میں ہی ممکن ہے ۔

اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری کامیابی اور نجات صرف عبادت رب کا رویہ اختیار کرنے اور شہادت حق کا فرض انجام دینے میں ہے کیوں کہ یہی مقصد تھا اُمت مسلمہ کو دنیا میں برپا کرنے کا ۔ ان فرائض کی پوری پوری تکمیل کے لئے انسانی معاشرہ میں نظام اسلام کا نفاذ اشد ضروری ہے ۔ اگر ہم نے انفرادی اور اجتماعی میدان میں اپنے ان فرائض سے کوتاہی کی تو یاد رکھیئے عذاب الٰہی سے ہمیں کوئی نہ بچا سکے گا ۔

یہاں غور فرمایئے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۴۱ اور ۴۲ پر جہاں نقشہ کھینچ دیا گیا اُخروی عدالت کا جس میں قوموں اور اُمتوں کے محاسبے کے وقت ان کے انبیاء اور رسول سرکاری گواہوں کی حیثیت سے پیش ہونگے اس ضمن میں وہ آیت قابل توجہ ہے جسکی قرأت حضرت عبداللہ بن مسعود سے سن کر آنحضور کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے ۔

"تو کیا ہو گا اس دن جبکہ ہم ہر امت میں سے اس کے خلاف ایک گواہ کھڑا کریں گے ۔ اور آپ کو کھڑا کریں گے (اے نبی) ان لوگوں کے خلاف گواہ کی حیثیت سے ۔ اس روز وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہو گا یا رسول کی نافرمانی کی ہو گی خواہش کریں گے کہ وہ زمین میں دھنس جائیں اور زمین

ان پر برابر کر دی جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے ۔"

اَب آئیے ایک

نظام مصطفےٰ کے نفاذ کے لئے راہ کیسے ہموار کی جائے ؟

اور سوال کی طرف کہ پاکستان میں نظام مصطفےٰ کو عملاً لاگو کرنے کے لئے پہلے کیا اقدام اٹھائے جائیں جن سے اس نظام کے نفاذ کی راہ ہموار ہو سکے :

(۱) اس وقت سب سے پہلے ان مبادی کی دعوت عام دینے کی ضرورت ہے جن کی بنیادوں پر خالص اسلامی سوسائٹی کی تعمیر ہوتی ہے - اور وہ یہ ہیں :

(الف) خدا پر ایمان کامل توحید کے ساتھ ۔

(ب) رسالت پر ایمان کامل اطاعت کے ساتھ ۔

(ج) آخرت پر ایمان کامل یقین کے ساتھ ۔

بقول مولانا اصلاحی صاحب یہی تین ایمانیات کے پہلو ہیں جن کے اندر خرابی پیدا ہونے سے سوسائٹی غلط راہوں کی طرف کھسکنا شروع ہو جاتی ہے ۔ اس دعوت کے لئے ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع کا اشتراک عمل ضروری ہے ۔

(۲) اسلام کو صرف ایک مذہب کی شکل میں چند عقائد اور چند رسوم کی حیثیت میں لوگوں کے سامنے نہ پیش کیا جائے (خاص طور پر نوجوان نسل کے سامنے) بلکہ ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت میں پیش کیا جائے ۔ تاکہ معلوم ہو کہ مطالبات دین کیا ہیں ۔

(۳) داعین اسلام چاہے وہ مساجد کے آئمہ ہوں ، نیک سرکاری ملازم ہوں ، دین کا درد رکھنے والے سیاستدان ہوں یا انکا شمار معاشرہ کے کسی بھی ایسے ذہین طبقہ سے ہو جو اسلامی نظام کا نفاذ چاہتا ہے ۔ یہ حضرات جب تک اپنے قول و فعل کے تضاد کو کم سے کم تر نہ کریں گے ۔ عوام کو اپنے وعظ و نصیحت سے متاثر نہ کر سکیں گے ۔ تبلیغ کا ذریعہ صرف الفاظ نہیں ۔ حقیقی اسلامی زندگی کا عملی مظاہرہ بھی ضروری ہے ۔

(۴) عوام کے ذریعے ہنگامی اور انقلابی تحریکیں تو چل سکتی ہیں اور یہ تحریکیں نچلی سطح سے چل کر اوپر کے نظام کو درہم برہم بھی کر سکتی ہیں لیکن ٹھوس اصلاحی اور عقلی دعوتیں اس وقت جڑ پکڑ سکتی ہیں جب اُوپر سے نیچے

کی طرف اثر انداز ہوں۔ حضرات انبیائے کرامؑ نے کبھی عام لوگوں کو پہلے خطاب نہیں کیا بلکہ سوسائٹی کے کارفرما عناصر کی ذہنیتوں کو تبدیل کرنے کی کوشش فرمائی اور ان کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ ہمیں اس طریق کار کو اپنانا ہوگا

(۵) سکولوں اور کالجوں میں صرف دینیات کے کورس کا رکھنا ہی کافی نہیں، بچوں اور نوجوانوں کے کریکٹر اور انکی شخصیت کی تعمیر کی بھی فکر ضروری ہے۔

(۶) ہمارے آئمہ مساجد عام طور پر مختلف دارالعلوموں سے ایک لگا بندھا کورس مکمل کرنے کے بعد تبلیغ دین کے فرائض ادا کرنا شروع کر دیتے ہیں مگر ان کی ذاتی تعلیم و تربیت اس نہج پر نہیں ہو پاتی کہ وہ آجکل کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنے خیالات اور اپنی شخصیت سے متاثر کر سکیں۔ نہ ہی دور حاضرہ کے عمرانی اور معاشرتی تقاضوں کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جدید ذہن و فکر کے حامل افراد کے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی مدرسوں اور دارالعلوموں میں قرآن، حدیث اور فقہ کے نصاب کے ساتھ عمرانیات۔ اجتماعی نفسیات، اقتصادیات جیسے اہم موضوعات سے بھی انہیں اچھی طرح روشناس کروایا جائے۔

(۷) تمام سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلباً اور اساتذہ کے لئے ہفتہ میں کم از کم ایک بار ایسے لیکچر ضرور رکھے جائیں جن سے انہیں معلوم ہو کہ قرآن کا پیغام ہے کیا اور یہ آخری کتاب الٰہی نوع انسان سے کیا مطالبہ کرتی ہے اور حضور نبی اکرمؐ نے کیا نمونہ ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ اسی طرح فیکٹریوں اور سرکاری دفاتر میں وہاں کے کارکنان کو قرآن سے روشناس کرانا بہت ضروری ہے۔

(۸) سینما، ٹیلی ویژن اور ریڈیو ایسے ذرائع ابلاغ ہیں کہ لوگوں پر اچھا تاثر بھی چھوڑ سکتے ہیں اور غلط بھی۔ ان کی فلموں اور پروگراموں پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ معاشرتی ذہن مطلوبہ نہج پر ڈھالا جا سکے۔

(۹) بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے کام ہیں جن کی بجاآوری کے لئے نہ کسی سرکاری آرڈیننس کی ضرورت ہے نہ کوئی خاص قانون بنانے کی۔ مثال کے طور پر ایک گھر کا سربراہ اگر چاہے تو خود بھی روزمرہ کی بول چال اور لین دین

اور سماجی تعلقات میں اخلاق حسنہ کا مظاہرہ کرسکتا ہے اور اپنے گھر والوں کی بھی مناسب تربیت کرسکتا ہے۔ خندہ پیشانی سے بات کرنا، دوسرے کی دل آزاری سے بچنا، ضرورت مند کی حتی المقدور مدد کرنا۔ پڑوسی کا خیال رکھنا، بڑوں کا احترام اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنا، غصہ پر قابو رکھنا، نماز روزہ کی خود پابندی کرنا اور گھر کے افراد کو ترغیب دینا وغیرہ وغیرہ ایسے کام ہیں جو معاشرہ میں صحت مند فضا پیدا کرسکتے ہیں۔

(۱۰) شہری محلہ جات اور دیہات میں نیک اور صالح افراد کی فلاحی کمیٹیاں بنائی جائیں جو نوجوانوں کے ساتھ خلوص و محبت اور شفقت سے رابطہ رکھیں، ان کے مسائل کے حل میں ان کی رہنمائی کریں۔ ان کی شخصیت کی تعمیر کیلئے مناسب تربیتی پروگراموں کا انتظام کریں۔ صحت مند تفریحی مقابلوں کا انتظام کریں، جو بچے اور نوجوان کوئی بھی خیر کا کام کریں اس کی مناسب تشہیر کی جائے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور دوسروں کو بھی فلاحی کاموں کی ترغیب ملے۔

(۱۱) بعض اوقات نیم خواندہ جذباتی قسم کے لوگ خود کو خدائی فوجدار بنا لیتے ہیں اور جہاں کسی سے کوئی کوتاہی ہوئی یا نماز روزہ کی ادائیگی میں غفلت ہوئی تو وہ اس بری طرح انہیں ڈانٹتے ہیں کہ بجائے ان کی اصلاح ہو اور وہ اپنے فرائض کی کوتاہی پر نادم ہوں، الٹا ان کے دلوں میں ایک چڑسی پیدا ہو جاتی ہے اور ان مبلغ صاحب کے لئے ایک نفرت کا جذبہ ان کے دلوں میں ابھر آتا ہے۔ یوں بعض اوقات وہ خیر کی راہ سے اور دور نکل جاتے ہیں حالانکہ اللہ اور اسکے رسول کا حکم ہے کہ دوسرے سے احسن طریق پر بات کرو۔ متذکرہ بالا محلہ فلاحی کمیٹیاں اس غلط قسم کی تبلیغ کو بھی روکیں جو بجائے نفع کے نقصان کا موجب بن رہی ہے۔

(۱۲) ایسے زمانے میں جب کہ ملحدانہ فلسفہ حیات اور مادہ پرستانہ نظریات کی یورش انسانی فکر اور سوچ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے وہاں لوگوں کو دین اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے صرف چند شرعی حدود اور

تعزیرات کا نفاذ کافی نہیں ۔ پہلے ان کی سوچ کے دھارے کو بدلنا ہوگا، ان کے دلوں میں مقام عبودیت کی عظمت کا احساس پیدا کرنا ہوگا ۔ ان کے منفی نظریات کو بُرا کہنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ جس تیزی سے یہ غلط نظریات پھیل چکے ہیں اور پھیل رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ مثبت نظریات کو معاشرہ میں پھیلانے کی ضرورت ہے، اس کے لئے حکومت اور اسلامی ذہن و فکر کے حامل اشخاص دونوں کی مربوط اور منظم کوشش درکار ہے ۔

(۱۳) بھوک و افلاس کا ستایا ہوا ایک نیک انسان بھی بعض اوقات معاشرہ کی اخلاقی حدود کو پھلانگ جاتا ہے مسلم سوسائٹی کا فرض ہے کہ ایسے افراد کی دستگیری کرے ۔ اب جبکہ ہم زکوٰۃ اور عشر کا نظام نافذ کر رہے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ جو روپیہ اس مد میں آئے اسے دیانتدارانہ طریق پر اکٹھا کر کے مستحق افراد تک پہنچایا جائے تاکہ اس نظام کی برکات کا لوگوں کو عملی ثبوت ملے ۔ اور وہ اسلام کے اخلاقی نظام، سیاسی اور انتظامی نظام، معاشرتی نظام اور روحانی نظام کے نفاذ کے بھی خود دل سے خواہاں ہوں اور پورا پورا تعاون کریں ۔

نظامِ مصطفےٰ کی چند خصوصیات[1]

میں نے اس مضمون کے شروع میں کہا تھا کہ نظام مصطفےٰ دراصل بہت سے نظاموں کا مجموعہ ہے جس میں اسلام کا اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور دیگر تمام نظام شامل ہیں ۔ آیئے دیکھیں کہ ان نظاموں کے چیدہ چیدہ نکات کیا ہیں جنہیں نظام مصطفےٰ اپنی لڑی میں پروتا ہے اور پھر وہ لڑی ایک مکمل ضابطہ حیات کی شکل میں معاشرہ کے ہر شعبہ کو اپنے حصار کے اندر لے آتی ہے ۔

اخلاقی نظام کی چند خصوصیات

(۱) اسلام کا اخلاقی نظام سب سے پہلے ایک فرد کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے : اسلامی نظام زندگی ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی

کہ اخلاقی ہدایات کا ماخذ اور منبع صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن اور اس کے رسُول اکرمؐ کی سُنت ہے اور یہ ہدایات ہماری خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بڑے بڑے مسائل کے حل میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

(۲) اخلاقی قانون کو سیاسی اور انتظامی قوتوں کے تحت نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر اس کے ضمیر کی آواز اور قوت نافذہ کو بھی بیدار کرتا ہے اور اسے بار بار آگاہ کرتا ہے کہ اس کا معاملہ اس حاکم مطلق کے ساتھ ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ دنیا کو دھوکا دے سکتا ہے مگر اپنے اللہ کو نہیں جس کے سامنے اسے ایک روز جواب دہ ہونا ہے۔ یوں اسلامی اخلاقی نظام ہر آدمی کے دل میں خوف خدا بٹھا دیتا ہے۔ اس کا اپنا ضمیر اندر سے اسے تعمیل احکام الٰہی کا حکم دیتا ہے، ایمان کی پختگی کے ساتھ یہ خوف خدا انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ کسی خارجی دباؤ کی عدم موجودگی میں بھی اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

(۳) یہ نظام خوف الٰہی کے ساتھ ساتھ اللہ کی محبت، اس کی رحمت اور جزا کی آس کو بھی دلوں میں پیدا کرتا ہے۔ یہ محبت اور یہ آس انسان کو اخلاقی نظام کی پیروی پر ابھارتی چلی جاتی ہے اور وہ بکمال شوق اس کا پابند ہو جاتا ہے۔

(۴) چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام کا اخلاقی نظام ایسی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف یعنی بھلے کاموں کو پھیلائے اور منکر یعنی برائیوں کو مٹائے۔

سیاسی نظام کی چند خصوصیات

(۱) زمین و آسمان میں حاکمیت صرف اللہ کی مانتا ہے۔

(۲) قانون صرف اللہ کا چلے گا جو اس نے اپنی کتاب میں دیا اور جس کی مستند تشریح حضور نبی اکرمؐ نے اپنے قول و عمل سے پیش فرمائی۔ احکام کتاب الٰہی اور سنت رسول کے مجموعے کا نام اسلامی اصطلاح میں شریعت ہے اور یہ شریعت ہی وہ اساسی دستور ہے جس پر اسلامی ریاست

قائم ہوتی ہے۔

(۳) انسان اس زمین پر اللہ کا خلیفہ یا نائب ہے اور اسی کے دیئے ہوئے اختیارات وہ اللہ کی زمین پر استعمال کرتا ہے۔ اس لئے حاکمیت تو اللہ کی ہوگی کیونکہ وہ مالک الملک ہے۔ البتہ جو ریاست قائم ہوگی وہ انسانی خلافت ہوگی جو اللہ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اور اسی کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر کام کرے گی تاکہ مالک کا منشا پورا ہو۔

(۴) مغرب کا نظریہ سیاسی "جمہوری حاکمیت" کا قائل ہے جہاں جمہور خود بادشاہ ہیں۔ اپنا قانون طرز زندگی یا شریعت وہ خود بناتے ہیں اور حکومت کا کام جمہور کے منشا کو پورا کرنا ہے۔ مگر اسلام جمہوری حاکمیت کی بجائے جمہوری خلافت کا قائل ہے۔ بادشاہی صرف خدا کی مانتا ہے۔ جہاں شریعت صرف وہ چلتی ہے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے سے دی اور حکومت کا کام جمہور کی منشا کو پورا کرنا نہیں بلکہ حکومت اور جمہور دونوں کا کام اللہ کی منشا کو پورا کرنا ہے۔

(۵) ریاست کا مقصد صرف انتظام ملکی ہی نہیں بلکہ اس خیر و فلاح کو عام کرنا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور بگاڑ کی تمام صورتوں کا سدباب کرنا ہے جو خدا کے نزدیک اس کی زمین کو اجاڑنے والی اور اسکے بندوں کو خراب کرنے والی ہیں۔ اسلامی ریاست اگر اپنے فلاحی کاموں کے پیش نظر غریب و مفلس افراد کے پیٹ کی آگ بجھانے کی فکر میں رہتی ہے تو ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھتی ہے کہ ان افراد کی زندگی اس نہج پر نہ چل پڑے کہ کل کو اُخروی زندگی میں وہ خود آگ کا ایندھن بن جائیں۔

(۶) ہر انسان کو چند بنیادی حقوق دیتا ہے خواہ وہ شخص اسلامی ریاست میں رہتا ہے یا باہر خواہ دوست ہو یا دشمن۔ مثلاً انسانی خون ہر حالت میں محترم ہے اور حق کے بغیر اسے نہیں بہایا جاسکتا عورت، بچے، بوڑھے، بیمار اور زخمی پر دست درازی کرنا کسی طرح جائز نہیں عورت کو بے آبرو نہیں کیا جاسکتا۔ بھوکا آدمی روٹی کا، ننگا آدمی کپڑے

اور زخمی اور بیمار علاج معالجہ کا ہر حال مستحق ہے خواہ وہ دشمن قوم سے ہی تعلق رکھتا ہو۔

ذمیوں (غیر مسلموں) کے لئے جو اسلامی ریاست کی حدود میں رہتے ہیں چند حقوق متعین ہیں۔ ان کی جان و مال اور آبرو بالکل مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو کی طرح محترم ہے۔ فوجداری اور دیوانی قوانین میں مسلم اور ذمی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ ان کے پرسنل لاء میں حکومت مداخلت نہیں کرے گی۔ انہیں اپنی مذہبی رسوم و عادات میں پوری آزادی ہے۔ ذمی اپنے مذہب کی تبلیغ ہی نہیں بلکہ قانون کی حد میں رہتے ہوئے اسلام پر تنقید بھی کر سکتا ہے۔

(۷) اسلام میں عدالت انتظامی حکومت کے تحت نہیں۔ ایک قاضی یا جج کو مقرر تو انتظامی حکومت کرے گی مگر وہ اس کو جواب دہ نہیں بلکہ اللہ کو جواب دہ ہے۔

(۸) اخلاقی پابندی صرف افراد پر ہی نہیں بلکہ ریاست پر بھی ہے کہ وہ اپنی سیاست، بے لاگ انصاف بے لوث سچائی اور ایمانداری پر رکھے اور مصلحت کی خاطر جھوٹ، فریب اور بے انصافی نہ کرے۔

اسلام کے معاشرتی نظام کی چند خصوصیات

(۱) ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے ناطے سے سب انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت سے برابر۔

(۲) انسان اور انسان کے درمیان اگر فرق ہو سکتا ہے تو نسل، رنگ، وطن اور زبان کی بنا پر نہیں بلکہ خیالات، اخلاق اور اصولوں کا ہو سکتا ہے۔ اور فضیلت کا معیار پرہیزگاری اور تقویٰ ہوگا۔

(۳) دُنیا کے تمام نسلی، وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس اسلام ایک

---

(۵) اسلام کا نظام حیات، (صفحہ نمبر ۱۹)

فکری، اخلاقی اور اصولی معاشرہ تعمیر کرتا ہے۔ ہر وہ شخص جو اللہ کی توحید پر یقین رکھے اس کو اپنا خالق، مالک، معبود اور رب مانے اور انبیاء کی لائی ہوئی ہدایت کو اپنا قانون زندگی مانے وہ اس معاشرہ میں شامل ہو سکتا ہے

(۴) چونکہ خاندان ہی انسانی تمدن کی جڑ ہے۔ اس لئے اسلامی معاشرتی اصولوں میں خاندان کے ادارے کو صحیح بنیادوں پر استوار رکھنے کی بہت تاکید ہے۔ مرد کو ناظم کی حیثیت حاصل ہے مگر عورت کو بے بس لونڈی کی حیثیت نہیں دی۔ اسلام کے نزدیک ازدواجی زندگی کی اصل روح محبت و رحمت ہے۔ خاندان کے افراد کے علاوہ رشتہ داروں اور ہمسایوں کے حقوق کا خاص خیال رکھتا ہے۔

(۵) عام اجتماعی زندگی کو جن بڑے بڑے اصولوں پر استوار کرنا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا اور بدی اور زیادتی میں نہیں۔

(۲) دوستی یا دشمنی رکھو تو صرف خدا کی خاطر۔

(۳) آپس میں بدگمانی سے بچو، غیبت، بہتان اور حسد سے بچو۔ دوسروں کے معاملات کا تجسس نہ کرو۔ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔

اقتصادی نظام کی خصوصیات

(۱) اسلام جس اقتصادی مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصول رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ کیونکہ نعمتوں کی تقسیم میں اللہ نے اپنی حکمت کی بنا پر بعض انسانوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

(۲) معاشی جدوجہد کی اس دوڑ میں جو لوگ ایک مقررہ حد سے پیچھے رہ جائیں یا دوڑ میں حصہ لینے کے قابل ہی نہ ہوں، اسلام اپنے نظام زکوٰۃ سے انکی دستگیری کرتا ہے۔ یہ اس کی اپنی اجتماعی انشورنس سکیم ہے جس

کی موجودگی میں اسلامی سوسائٹی میں کوئی شخص ناگزیر ضروریات سے محروم نہیں رہ سکتا۔

(۳) یہ نظام فرد کو جماعت میں ایسے گم نہیں کرتا کہ اس کی آزادی ہی باقی نہ رہے جو اس کی شخصیت کی صحیح نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ اس کے نزدیک انفرادیت کے لئے جس طرح سیاسی اور معاشرتی آزادی ضروری ہے اسی طرح معاشی آزادی بھی بہت حد تک ضروری ہے۔ مگر ساتھ ہی ایسے اجتماعی نظام کو بھی پسند نہیں کرتا جو افراد کو معاشرت اور معیشت کے میدان میں ایسی بے لگام آزادی دے دے کہ وہ اپنی خواہشات یا مفاد کی خاطر جماعت ہی کو نقصان پہنچا دیں۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان متوسط راہ اختیار کرتا ہے۔

(۴) فرد پر جماعت کی برتری کے لئے چند حدود عائد کرتا ہے اور اسے کچھ ذمہ داریوں کا پابند کرتا ہے اسے کسب معاش کے میدان میں واضح طور پر بتاتا ہے کہ کون سا کاروبار اس کے لئے حرام ہے کون سا نہیں؟ اس کے حقوق ملکیت کو تسلیم کرتا ہے مگر محدود دائرے کے اندر۔ مال خرچ کرنے پر بھی ایسی قیود لگائی گئی ہیں جن سے صاف ستھری پاکیزہ زندگی تو گزار سکتا ہے مگر عیاشیوں میں دولت نہیں اڑا سکتا۔

(۵) جائز حدود کے اندر کمائی ہوئی دولت کو بھی یہ نظام زیادہ دیر تک سمٹا نہیں رہنے دیتا بلکہ اپنے قانون وراثت سے پشت در پشت پھیلاتا جاتا ہے۔

اس ساری بحث کے آخر میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نظام مصطفےٰ کے نفاذ کے لئے پوری کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے اور ہم اہل پاکستان کے لئے تو اور بھی ضروری ہے کہ اس سرزمین میں اس نظام کو کلیتاً نافذ کر کے دنیا کو دکھائیں جس کے نفاذ کے لئے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ آج دنیا میں مادہ پرستانہ نظریات اور منفی قوتیں کچھ

ایسی تیزی سے پھیل رہی ہیں کہ بعض اوقات مخلص اور دیندار حضرات بھی گھبرا کر سوچنے لگتے ہیں کہ شاید یہ نظام دور جدید کے تقاضوں پر اب پورا نہ اتر سکے۔ مگر یاد رکھیں یہ شیطان کا دھوکہ ہے جو وہ ہمیں دے رہا ہے۔ اگر حضور نبی اکرم کے بعد کسی بھی مسلم معاشرہ میں دین اسلام کا قیام ناممکنات میں سے ہوتا تو اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو تا قیامت شہادت علی الناس کا فریضہ کبھی نہ سونپتا۔

ایک مسلمان کی زندگی تو ہے ہی پیہم جہاد۔ جہاد اپنے نفس کی سرکشی کے خلاف اور جہاد تمام غیر دینی قوتوں کے خلاف۔ یہی اس کا امتحان ہے، یہی اس کا مقصد حیات۔ اللہ تو کہتا ہے کہ اے مومنو ہم نے تمہارا مال اور تمہاری جان خرید لی ہے آخرت کی نعمتوں کے عوض۔ پھر ایک مومن اس سودے کے بعد کیسے خاموش بیٹھ سکتا ہے۔ اس سے تو ایک روز باز پرس ہوگی کہ اس نے عبادت رب اور شہادت حق کی ادائیگی کے لئے اس دنیا میں کیا کیا۔ اگر وہ اپنی مالی، ذہنی اور جسمانی قوتوں کو کسی غیر مطلوبہ راہ میں خرچ کر رہا ہے۔ تو نقصان اس کا اپنا ہے۔ بظاہر وہ اس دنیا میں چاہے ٹھاٹھ دار زندگی گزارتا نظر آئے مگر وہ خسارے میں ہے اور خسارہ بھی ایسا کہ جس کے کرب اور عذاب کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی خسارہ کا ذکر سورۂ العصر میں ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

> زمانے کی قسم کہ انسان خسارہ میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ اور آپس میں حق (بات) کی تلقین کرتے اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس خسارہ سے بچائے۔ آمین۔

نوٹ: اس مضمون کی تیاری کے لئے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا:

۱ - مطالبات دین، ڈاکٹر اسرار احمد، مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی، لاہور
۲ - دعوت دین اور اس کا طریق کار، مولانا امین احسن اصلاحی، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور
۳ - اسلامی نظام زندگی (۴) اسلام کا نظام حیات (۵) اسلامی ریاست - سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - لاہور -

مکتوب پاکستان
"الدعوۃ" قاہرہ

میں بھی حاضر تھا وہاں

اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس اس ہنگامی اجلاس کے ٹھیک چار ماہ بعد منعقد ہوئی جو مسلم ملک افغانستان پر سرخ اشتراکیت کے حملے سے نبٹنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ ہنگامی کانفرنس نے کچھ قراردادیں اور کچھ سفارشات منظور کی تھیں جن میں سے ایک بھی مؤثر طور پر نافذ نہ ہو سکی۔ اس کا اظہار اسلامی کانفرنس کے سیکرٹری جنرل جناب شطی نے اپنے اس خطاب میں کیا جس میں انہوں نے فرمایا: "بیشک قراردادیں ان حوادثات سے متعلق تھیں جو اس اسلامی خطہ پر منڈلا رہے ہیں۔ لیکن افغانستان کی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آسکی جب کہ یہی وہ بات ہے جو ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس نازک مسئلے پر مسلسل نظر رکھیں۔" چنانچہ تمام مخلص شرکاء کانفرنس اور مبصرین بددلی اور مایوسی کا شکار تھے یہاں تک کہ بعض نے تو کہہ بھی دیا کہ ہمیں نئی قراردادوں کی نہیں بلکہ پہلی قراردادوں کو عملاً نافذ کرانے کی ضرورت ہے، اور ہمیں صورت حال اور بھی تاریک نظر آنے لگتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سرخ اشتراکیت کی جارحیت کا شکار افغان عوام کے رہنماؤں کو ان کے نمائندوں کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت سے محروم رکھا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ افغان مسئلے پر کچھ باہمی صلاح مشورے ہوئے اور ان کا تانا بانا کانفرنس کے انعقاد سے چند روز پہلے رات کی تاریکی میں بُنا گیا۔ شام، لیبیا، جمہوریہ یمن اور تنظیم آزادی فلسطین کے نمائندوں نے اس قضیہ کو اہم بنایا انہوں نے روسی سفیر سے ملاقات کی تاکہ سوویت یونین کا دفاع کیا جائے اور اس مسئلے کو کانفرنس کے اندر تک ہی محدود رکھا جائے تاکہ کانفرنس کا اوّلین اور اہم ترین مسئلہ نہ بن سکے۔ یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب رہے، افغان عوام کا مسئلہ

فلسطین، بیت المقدس اور ایران کے بعد چوتھے نمبر پر رکھ دیا گیا۔ بلکہ ماسکو کی آلۂ کار حکومتوں کے ان نمائندوں نے تو بت یہاں تک پہنچا دی کہ انہوں نے اتحادِ اسلامی برائے آزادیٔ افغانستان کے صدر پروفیسر عبدالرسول سیاف کو براہ راست افغان عوام پر ہونے والے ظلم وستم پر بولنے کا حق دینے سے بھی انکار کر دیا اور اصرار کیا کہ وہ صرف ایرانی وفد کے پلیٹ فارم پر سے کچھ کہہ سکتے ہیں اگر وزیرِ خارجہ ایران نہ ہوتے تو شاید انہیں کانفرنس ہال میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہ ملتی۔ وزیرِ خارجہ ایران جناب قطب زادہ نے انہیں ایرانی وفد کے ارکان کی حیثیت سے شمولیت کی فرمائش کر دی جسے ان نمائندوں نے بادلِ نخواستہ قبول کر لیا۔ اگرچہ وہ کانفرنس سے چلے جانے کی سوچ رہے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایک یادداشت بھی صدر کانفرنس کو لکھ بھیجی۔ لیکن انہیں مشورہ دیا گیا کہ وہ ارکانِ کانفرنس کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کرنے کے لئے اس موقع کو ضائع نہ کریں۔

مسئلہ افغانستان سے متعلق کانفرنس کی قرارداد میں انہیں حدود کے اندر محدود رہیں جو ماسکو کی پٹھو حکومتوں کے یہ نمائندے چاہتے تھے۔ چنانچہ سوویٹ یونین کیلئے مذمت کا ایک لفظ بھی نہ کہا جا سکا۔ اور نہ افغانستان کے مسلم عوام کے مفاد میں کوئی قرارداد منظور کی گئی۔ ہوا تو بس اتنا ہوا کہ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو اسلامی کانفرنس کے سیکرٹری جنرل، ایران و پاکستان کے وزرائے خارجہ پر مشتمل ہے وہ ایسے وسائل اور طریقے تلاش کرے جن سے افغانستان کے اس عظیم بحران کا ایک عام حل دریافت ہو۔ اس سلسلے میں ضروری مشورے ہوں اور اقوام متحدہ کی زیر نگرانی حکومتی سطح پر ایک کانفرنس منعقد ہو وغیرہ وغیرہ اور یہ سب کچھ اس طرح ہو کہ اس قرارداد کے الفاظ سے متعارض نہ ہو۔ یہ ہے حقیقت ان فیصلوں کی جن پر اس کانفرنس کے ارکان مسئلۂ افغانستان کے بارے میں پہنچ سکے بلکہ تنظیم آزادی فلسطین کے نمائندے نے تو مسلمان حکومتوں اور سوویٹ یونین کے درمیان دوستی کو برقرار رکھنے پر بایں الفاظ زور دیا کہ :

"ایران کے برخلاف امریکہ کے فوجی اقدامات کو دیکھتے ہوئے ڈر ہے کہ کہیں جنگ کی یہ سیاست جس پر امریکی ادارے چل رہے ہیں اور افغانستان میں ہونے والی

تبدیلیوں کے نتائج پر یہ واویلا ہمارے بعض بھائیوں پر معاملات کو خلط ملط نہ کرنے اور غلط فہمی کا شکار ہو کر دشمن کو دوست اور دوست کو دشمن نہ سمجھ لیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان حکومتوں اور سوویٹ یونین یا سوشلسٹ نظام کے حامل ممالک کے درمیان پائی جانے والی دوستی کی حفاظت کریں اور سامراجی منصوبوں کی راہ کاٹ دیں جو مسلمانوں کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں سوویٹ یونین کی اس یقین دہانی پر اعتماد کرنا چاہیئے کہ اس کی فوجیں افغانستان میں ایک محدود وقت تک کے لئے ہیں۔

ایک دوسرے کی تذلیل کانفرنس کے اندر، انہی ماسکو نوازوں کی آواز ہی غالب رہی، روسی بلاک ۔ امریکی بلاک پر چھایا رہا اور ایسا بھی ہوا کہ صومالیہ کے وزیر خارجہ نے افریقی خطے کے حالات بیان کئے اور وہاں روس کی موجودگی کا ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح وہاں اس کا وجود صومالیہ کے امن و سلامتی کے لئے خطرہ ہے کیونکہ اس نے جمہوریہ صومالیہ کے پڑوس میں ساٹھ ہزار چھاتہ بردار فوجی جمع کر رکھے ہیں۔ کیوبا اور حبشہ کے لشکر اُن کے علاوہ ہیں جن کو روسی افسر تربیت دے رہے ہیں۔ یہ فوجیں صومالیہ کے دیہات و قصبات پر مسلسل اور بار بار چڑھائیاں کرتے رہتے ہیں۔ اس پر لیبیا کے وزیر خارجہ فوراً روس کی مدافعت کرنے مجھے لئے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: صومالیہ کے وفد پر لازم آتا ہے کہ وہ وضاحت کرے کہ اس پر کب زیادتی ہوئی اور اس کا ذمہ دار کون تھا؟ اس حقیقت کو واضح کرنا ضروری ہے کہ صومالیہ کا نظام پہلے مارکسسٹ نظام تھا اور پھر وہ مغربی امریکی ہو گیا اور کچھ پتہ نہیں کل کو بدل کر صیہونی ہو جائے۔ جب اس کا نظام سوشلسٹ تھا تو اس نے مسلمان علماء کو قتل کیا اور انہیں مادہ پرست بنا دیا۔ آج صومالیہ کا نمائندہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر زیادتی ہو رہی ہے، کس طرف سے؟ صومالیہ پر کوئی زیادتی نہیں ہو رہی۔ بلکہ الٹا صومالیہ مسلمان عرب قوم پر زیادتی کر رہا ہے۔ حالانکہ صید برّی نے سامراجی ملک بنتے وقت اعلان کیا تھا کہ وہ امریکہ کو کوئی سہولت بہم نہیں پہنچا رہا۔ اس پر صومالیہ کے وزیر خارجہ کھڑے ہوئے اور ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہنے لگے: میں اس جھگڑے میں

نہیں پڑنا چاہتا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کون ملک ہے جس نے غیر ملکیوں کو اڈے مہیا کئے۔ لیبیا یا صومالیہ؟ نیز وہ کون ہے جو ہر روز نیا روپ دھار لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دل کو سخت قلق ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بیالیس حکومتوں کے نمائندے جو مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں، مغرب و مشرق یا ان کے پیروکاروں کے خیمہ بردار بنے ہوئے ہیں اور وہ اس سُپر پاور کی زبان میں بات کرتے ہیں جس سے وہ منسوب ہیں، چاہے اس میں مسلمانوں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

کانفرنسوں کی آڑ دراصل کرائے کے یہ ٹٹو اکثر ان کانفرنسوں کو آڑ بنا کر اپنے قبیح چہروں کو ان کے پیچھے چھپاتے اور پھر حملہ آور ہوتے ہیں جیسا کہ حکومتِ شام نے کیا جس کے سربراہ بعث پارٹی کے رہنما حافظ الاسد نصیری ہیں جو اپنے آپ کو صیہونیوں کے مقابلہ میں مردِ آہن قرار دیتے ہیں اور یہ بات بھول گئے ہیں کہ ۱۹۶۷ء کی ہزیمت میں جولان، یہودیوں کے حوالے کر دینے والے وہی ہیں۔ اور انہوں نے شام کے اکثر شہروں کو مجاہد شامی نوجوانوں کے قتل گاہیں بنا رکھا ہے۔ شام کے نائب وزیرِ خارجہ ناصر قدوری وہ شخص ہے جس نے کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کی مخالفت کی، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور صیہونی دشمن پر تنقید کی اور کانفرنس سے مطالبہ کیا کہ اس معاہدہ کے تمام فریقوں کے خلاف سخت ترین قرارداد منظور کی جائے۔ اسے یقین ہے کہ وہ حافظ الاسد کے خون آلود چہرے کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتا، اگر اچانک اسے مجاہد شامی عوام کی پکار ارکانِ کانفرنس کے سامنے پڑی نظر نہ آتی جس نے حافظ اسد کی فرقہ وارانہ حکومت اور اس کے نظام کی رسوائیوں کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا۔ اس 'پکار' کو پڑھ کر شامی وفد کی سٹی گم ہو گئی۔ اس کے ارکان خوفزدہ حالت میں ارکانِ کانفرنس کے سامنے پڑی 'پکار' کے متعلق بحث کرتے اور اسے کھسکانے کی کوشش کرتے پائے گئے (اس سے پہلے کہ وہ شرکائے کانفرنس کے ہاتھوں تک پہنچ پائے) خاص طور پر عراق اور مغرب کے نمائندوں تک پہنچنے سے پہلے، کیونکہ ان کے درمیان پہلے سے کشمکش موجود ہے!) لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگ مہیا کر دیئے جنھوں نے کھسکائے ہوئے اوراق 'پکار' کی جگہ اس کی عکسی کاپیاں ہر نمائندے کے کاغذات میں رکھ دیں (النداء 'پکار') ہمارے وطن اسلامی سے متعلق

ایک منشور ہے!)

کانفرنس کا حافظہ کمزور ہے کانفرنس اکثر اپنی یادداشت کھو بیٹھتی ہے اور اپنے ہنگامی اجلاس میں منظور کردہ قراردادوں کو بھُلا دیتی ہے یا بالفاظِ دیگر اس کے ارکان اپنی کسی اندرونی ضرورت کی وجہ سے انہیں جان بوجھ کر بھلا دیتے ہیں۔ اریٹیریا کی آزادی کے لئے جدّوجہد کرنے والی جماعتوں کی مرکزی مجلس کے صدر نے مجھے بتایا کہ اسلامی وزرائے خارجہ کی چوتھی کانفرنس نے جو بن غازی میں ۲۶ مارچ ۱۹۷۳ء میں منعقد ہوئی، نے ایک اعلان منظور کیا کہ وہ اریٹیریا کے عوام کے حقِ خودارادیت کی تائید اور ان کے ساتھ مکمّل ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔ اور افریقی اتحاد کی تائید کرتی ہے کہ افریقی وحدت رہتے ہوئے اس قضیّہ کو نبٹانے اور ایسا حل تجویز کرے جو اریٹیری عوام کے لئے قابلِ قبول ہو اور جس سے علاقے کا امن وسکون بھی محفوظ رہے۔ اس نے اپنے ارکان کو تاکید کی کہ وہ اریٹیری عوام کو امداد پہنچائیں اور قضیّہ کے عادلانہ حل کے لئے حکومتِ ایتھوپیا سے اپنے روابط کو کام میں لائیں اور حکومت ایتھوپیا سے مطالبہ کیا کہ وہ امن پسند اریٹیریا کے عوام کے خلاف فوجی اقدامات کو روک دے لیکن کانفرنس اریٹیریا کے مسئلے اور اس کے عوام دونوں کو بھول گئی۔ یہاں تک کہ جب اریٹیریا کا وفد کانفرنس مبصّر کی حیثیّت سے شمولیّت کی غرض سے حاضر ہوا تاکہ وہ انہیں ان کی قرارداد یاد دلائے اور ان کے مسائل حل کرنے کے لئے کسی قرارداد کے اجراء کی فرمائش کرے تو کانفرنس نے اس طرح کان بند کر لئے گویا کبھی کوئی قرارداد منظور نہ کی تھی۔

آخر کی بات اس طرح کی کانفرنسیں کبھی بھی عوام کے مسائل حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ یہ تو صرف حکومتوں اور حکمرانوں کے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے ہتھکنڈے ہیں۔ مسلمان عوام کے لئے اپنے موجودہ تکلیف دہ حالات سے عہدہ برآ ہونے کا صرف ایک ہی طریق ہے اور وہ ہے جہاد ..... اپنے اس جامع مفہوم کے ساتھ جس کا آغاز جہادِ نفس سے ہوتا ہے اور جس کی انتہا سرکش قوتوں سے معرکہ آرائی اور غاصب عیسائیوں، یہودیوں اور اشتراکیوں وغیرہم سے اپنے حقوق بقوّت چھین لینے میں ہوتی ہے ۔

دارالعلوم دیوبند میں خلفشار - الفرقان لکھنؤ کا اداریہ

اب سے ۵۶ - ۵۷ سال پہلے جب یہ عاجز ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں دو سال مقیم رہا تھا تو حضرت مولانا محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرسین اور شیخ الحدیث تھے، اُن کے علاوہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا سید اصغر حسین عرف حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ صف اوّل کے اکابر اساتذہ میں تھے۔ یہ حضرات صرف اساتذۂ درس ہی نہیں تھے بلکہ جہاں تک بشری اندازہ ہے (واللہ اعلم عند اللہ) یہ اپنے اپنے رنگ میں سراپا اخلاص و تقویٰ "رجال اللہ" اور "رجال آخرت" تھے، ان کو دیکھ کے دل کہتا تھا کہ ان کی فکر بس رضائے الٰہی اور آخرت کی فکر ہے —— ان کی علاوہ دوسری صف کے جو حضرات اساتذہ تھے قریباً وہ سب بھی کم و بیش کے کچھ فرق کے ساتھ اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے —— فطری طور پر طلبہ پر بھی اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق اس کا اثر پڑتا تھا اور کم از کم یہ آرزو ضرور پیدا ہوتی تھی کہ اس دولت کا بھی کچھ حصہ نصیب ہو۔ بہرحال میری طالب علمی کے اس دور میں دارالعلوم کی عام فضا پر اخلاص للہ اور فکر آخرت کا غلبہ[1] تھا۔

اس دور کے بعد کچھ تغیرات اور زمانے کی رفتار کے فطری نتیجہ میں دارالعلوم کی اس فضا میں فرق پڑنا شروع ہوا۔ لیکن حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی جامع اور طاقتور شخصیت سے اس فضا کو طویل مدت تک سہارا ملتا رہا۔ مگر حضرت ممدوح کے بعد اس فرق و انحطاط کی رفتار تیز، اور ادھر کے آخری چند سالوں میں تو بہت ہی تیز ہوگئی، ہمارے اس گھر میں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری اس برادری میں اس لحاظ سے جو زوال و انحطاط آیا ہے اور ہم نے جو کچھ کھویا ہے، اگر ہم میں احساس ہو تو وہ بڑا المناک حادثہ ہے —— آج کل اخبارات

---

[1] راقم سطور کا قیاس بھی ہے اور اساتذہ اور اکابر سے سنا بھی ہے کہ دارالعلوم کے اس سے پہلے ادوار (حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی صدارت تدریس کے دور) اخلاص و تقوے کی فضا کے لحاظ سے اس سے بھی فائق اور مبارک تر تھے۔

دوسرے ذرائع سے بھی دارالعلوم سے متعلق فتنہ و فساد کی جو انتہائی تکلیف دہ خبریں پہنچتی رہتی ہیں اُن کی جڑ بنیاد دراصل یہی تغیر حال اور یہی فساد مزاج ہے خواہ اس کا ذمہ دار کوئی بھی عنصر ہو۔

اس عاجز کا جو تعلق دارالعلوم سے ہے وہ کسی ادارے سے نہیں اور جو جماعت دیوبند سے ہے وہ کسی جماعت سے نہیں اس لئے اس صورت حال کے احساس سے شدید قلبی و روحانی اذیت ہے۔ "انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ"

میں قریباً ۳۵ - ۴۰ سال سے اس کی مجلس شوریٰ کا رکن بھی ہوں (جس کے ہاتھ میں) دستور کے لحاظ سے دارالعلوم کے سارے اختیارات ہیں) اس طویل تجربہ کے بعد میرا یہ یقین ہے کہ جس تغیر حال کا ذکر میں نے کیا ہے اور جو میرے نزدیک موجودہ افسوسناک حالات کا اصل سبب ہے اس کا علاج نہ موجودہ مجلس شوریٰ کر سکتی ہے نہ باہر کی کوئی تحریک اور کوشش۔ اس کی اصلاح کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم سب جن کا دارالعلوم سے ذمہ دارانہ اور عاملانہ تعلق ہے (اگر اللہ توفیق دے تو) خود اپنا احتساب کریں اور اخلاص و صدق دلی سے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست کریں۔ —— ظاہر ہے کہ علماء کی ذمہ داری عوام سے بہت زیادہ ہے —— اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو اللہ کا قانون بڑا بے لاگ ہے —— قرآن پاک میں انبیاء علیہم السلام کی ایک نسل کے بارہ میں فرمایا گیا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

یہ عاجز اپنے بارے میں ہرگز کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہے "من آنم کہ من دانم" اس کی بھی کوئی خاص اُمید نہیں ہے کہ اس گزارش کا کوئی بڑا اثر ہوگا جو کچھ عرض کیا گیا ہے بس معذرۃً الی ربی عرض کیا گیا ہے۔

ٹورنٹو (کینیڈا) میں

گذشتہ سال ڈاکٹر اسرار احمد کے درسِ قرآن
کے ضمن میں جو اشتہار شائع ہوا تھا اس کا عکس

اعـلان

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی حسب ذیل کتب کے نئے ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں -

● تالیفـات : **مولانا امین احسن اصلاحی**

— **حقیقت دین** : (مشتمل بـر حقیـقت شرک ، حقیـقت تـوحیـد ، حقیـقت تقـوی و حقیقت نماز)

— **مبادی تدبر قرآن** : (تدبر قرآن کے اصول و قواعد پر اہم دستاویز)

● تالیفـات : **ڈاکٹر اسرار احمد صاحب**

— **اسلام کی نشاۃ ثانیہ** : ، کرنے کا اصل کام (اضافہ شدہ)

— **دعـوت الی اللہ**

— **علامـہ اقبـال مرحوم اور ہم** -

● ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتب کے حسب ذیل انگریزی تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں -

1. The Way to Salvation—in the light of Surah Al-'Asr.
2. The Islamic Renaissance—The Real Task Ahead.
3. The Quran and the World Peace.
4. Two Periods of Rise and Decline of Muslim Ummah.

مـکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۔ لاہور

۳۶ ـ کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور (فون : 852611)

کراچی ڈپو : ۱۴۴ ـ سنی پلازہ ، مولانا حسرت موہانی روڈ ، کراچی-۱

پبلشرز : ڈاکٹر اسرار احمـد ● طابع : رشید احمد چوہدری
مطبع : مکتبہ جدید پریس ، شارع فاطمہ جناح ـ لاہور

Regd. L. No. 7360

زیر تعمیر قرآن اکیڈمی کے تین منظر

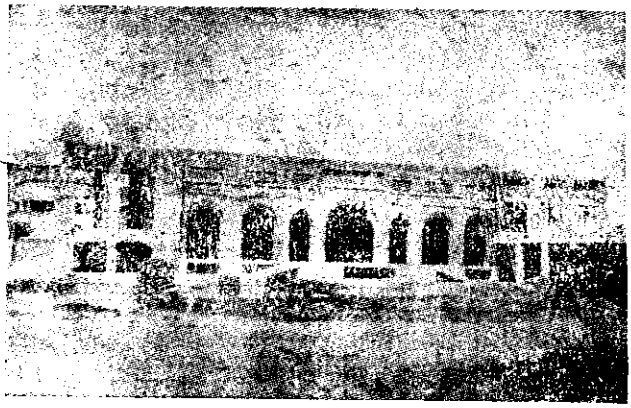

"جامع القرآن"
(جامع مسجد)
←——

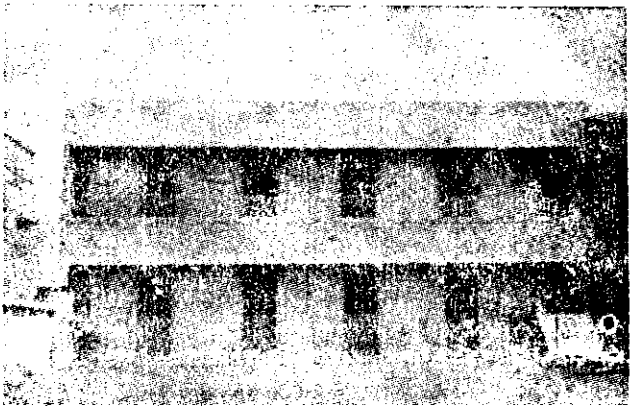

"دارالمقامہ"
(ہاسٹل)
——→

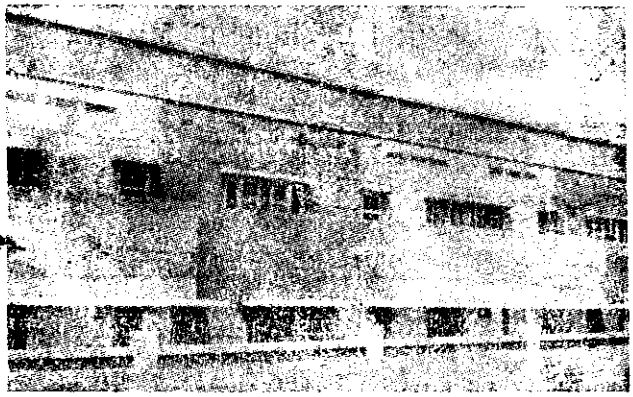

"رہائشی مکانات"
←——